رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

ذی الحجہ ۱۳۷۵ھ   جلد ۴۶ عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ اے ذیلدار پارک ، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے   قیمت فی پرچہ دس آنے

خــــالی صفحــــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۶	ذی الحجہ ۱۳۷۵ھ - مطابق ستمبر ۱۹۵۶ء	عدد ۶

اشارات	نعیم صدیقی	۲
مقالات:		
عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ	مولانا امین احسن صاحب اصلاحی	۱۷
محسن انسانیت	نعیم صدیقی	۴۳
تزکیۂ نفس	مولانا امین احسن صاحب اصلاحی	۵۹
رسائل و مسائل:		
حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ کی توجیہ	ادارہ	۶۶
ائمہ اربعہ و اہل بیت	"	۶۹
مباہلہ و مناظرہ	"	۷۰
مطبوعات	نعیم صدیقی	۷۲

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ۔ لاہور سے
شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اسلامی شریعت کی مثال ایک سدا بہار درخت کی سی ہے۔ اساسی عقاید و نظریات اس درخت کی جڑیں ہیں، نصوص سے اس کا تنا بنتا ہے، قانون کے اصول و غایات اس کے بڑے بڑے ٹہنے ہیں، اجماعی فیصلے گویا کونپلیں چھوڑنے والے انکھوے ہیں اور وقتی اور جزئی مسائل و احکام اس کی پتیاں ہیں۔ اس درخت کی جڑیں، تنا اور اس کے ٹہنے اپنی جگہ جوں کے توں قائم رہ کر نشو و نما پاتے ہیں، لیکن اس کی پتیوں میں سے تھوڑی تھوڑی موسمی اثرات کے تحت گرتی رہتی ہیں اور ان کی جگہ نئی پتیاں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔

گویا ہر قانونی نظام کی طرح ہمارے قانونی نظام کا ایک عنصر مستقل ہے، دوسرا تغیر پذیر۔ پہلے عنصر میں صلابت اور جماؤ ہے، دوسرے میں بہاؤ اور سیلان اور لچک ہے۔ پہلا اپنے ذرّے ذرّے کا شدید تحفظ چاہتا ہے اور بدلتے حالات کے سانچوں میں ڈھلنے پر تیار نہیں ہوتا بلکہ وہ سانچوں کو اپنی ساخت کے مطابق بدل لیتا ہے اور نہ بدلیں تو ان کو توڑ ڈالتا ہے، دوسرا عنصر پہلے کے زیر اثر رہتے ہوئے اور بدلتے حالات میں اپنے لیے مناسب جگہ پیدا کر لیتا ہے۔ پہلا "با زمانہ ستیز" کی فطرت رکھتا ہے، دوسرے کا مزاج "با زمانہ بساز" کا ہے۔ پہلے عنصر سے ہمارا امتیازی ملی وجود بنتا ہے اور دوسرا اس امتیازی وجود کو مختلف قسم کے ماحول میں پنپنے کے قابل بناتا ہے۔ پہلا عنصر ہمیں اپنے ماضی سے مربوط کرتا ہے اور دوسرا مستقبل کی طرف متوجہ رکھتا ہے۔

بیک دم ایک پہلو سے جماؤ کی ضرورت ہے، دوسرے پہلو سے بہاؤ کی! ان دوگونہ تقاضوں میں اگر توازن برقرار نہ رہے تو کوئی بھی قانونی نظام بقا و ارتقاء کے قابل نہیں رہتا۔ اگر مستقل عنصر کی صلابت ختم ہو جائے تو قانون کی بنیادیں اور اس کا مجموعی ڈھانچہ برباد ہو جاتا ہے اور اگر تغیر پذیر عنصر کا بہاؤ رک جائے تو اس کا فطری نشو و نما رک جاتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے کے اندر دو انتہا پسند اور متضاد رجحانات باہم دگر متقابل ہو کر موجود ہیں اور دونوں اپنا اپنا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ ایک پیچھے کی طرف دیکھتا ہے اور آگے بڑھنے کو تیار نہیں، دوسرا آگے دوڑنا چاہتا ہے مگر پیچھے کوئی تعلق جڑا نہیں رہنے دینا چاہتا۔ ایک جماؤ ہی جماؤ چاہتا ہے اور جزئیات تک کے لیے تغیر پذیری کی گنجائش نہیں دیتا۔ دوسرا بہاؤ ہی بہاؤ چاہتا ہے اور اصول و روایات کے اساسی سرمائے تک کو مستقل نہیں رہنے دینا چاہتا۔ ایک کے سامنے مغربی تمدن کی منزل مقصود ہے اور وہ اپنی قومی خودی، اپنی امتیازی ہیئت اور اپنے جداگانہ وجود تک کو ختم کر کے بگٹٹ اس سمت میں لپک جانا چاہتا ہے۔ دوسرے کو اپنے دین اور اپنے اصول اور اپنی روایات و اقدار کے تحفظ کا سخت اہتمام ہے لیکن وہ نہ جدید حالات اور تقاضوں کی پوری سوجھ بوجھ رکھتا ہے اور نہ اجتہادی ذہن کو کام میں لا کر مسائل حاضرہ کو حل کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ جو کچھ کام ہو چکا ہے وہ سارا دریا برد کر کے نئے سرے سے سوچنا چاہیے، دوسرا کہتا ہے کہ پچھلا سرمایہ فقہ قیامت تک کے لیے تمام جزئیات میں کافی ہے۔ لہٰذا اس پر ذرہ بھر اضافہ کرنے یا اس میں ردّ و بدل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

جماعت اسلامی بیچ کا وہی نقطۂ نظر پیش کرتی ہے جس کا تقاضا ہمارے قانونِ شریعت کی فطرت کرتی ہے یعنی اس شریعت کا جتنا اصولی عنصر مستقل قدر و قیمت کا ہے اس کا سختی سے تحفظ کرتے ہوئے اس کے اجتہادی عنصر میں جائز اور ضروری حد تک بہاؤ پیدا کیا جائے۔ خصوصاً اب جبکہ پاکستان ایک اسلامی ریاست بننے کی راہ پر پڑ گیا ہے اور جب کہ سرزمینِ پاک میں نظامِ اسلامی کو عملاً برپا کر دینے کا آغاز ہو گیا ہے، ناگزیر ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلے۔ اور بجائے اس کے کہ صدمۂ فتنہ امیں پڑ کر غلط طرزِ فکر سے متحرک ہونے والے ہاتھ اسے بے جا طریقے سے کھولیں، چاہیے یہ کہ صحیح طرزِ فکر رکھنے والے عناصر خود آگے بڑھ کر اس کے قفل وا کریں اور پورے انضباط کے ساتھ تدریجاً اس کے کواڑ کھولیں۔ مذہبی عناصر کی طرف سے اگر مطلوبہ فکری توازن رو بہ عمل آ جائے تو پھر تمام اعتدال پسند عوام کی توجہات اور توقعات کو وہ اپنی طرف سمیٹ سکیں گے اور اربابِ فتنہ کے لیے میدان تنگ ہونے لگے گا۔ ورنہ اگر ہوئے

اب بھی اجتہاد کے دروازے کو بند رکھنے پر اصرار کیا تو زندگی کے عملی مسائل و معاملات کے دباؤ سے فائدہ اٹھا کر غلط طاقتیں سرے سے اس دروازے کو توڑ ڈالیں گی اور اجتہاد کے نام سے پورے دین کا صفایا کر دیں گی۔

ہمارا پارٹ اس معاملے میں یہ بھی ہے کہ ایک طرف تو خود اپنے حلقوں میں دینی اور جدید دونوں قسم کے علوم سے آراستہ ذہن پیدا کیا جائے اور دوسری طرف جدید اور مذہبی طبقوں کو باہم دگر قریب لایا جائے تاکہ وہ اسلامی بنیادوں پر ریاست اور معاشرے کی تعمیر کرنے کے کام میں ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں۔ کسی طرح ایک صف کے علمِ دین اور دوسری صف کے علمِ دنیا کو اکٹھا ہونا چاہیے جو ملکی اور بین الاقوامی دائرے میں اب ہمارے سامنے ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے ہمیں اپنی آئیڈیالوجی کی سربلندی اور اپنے اصول اساسی اور اپنی مخصوص ذہنی و ملی ساخت کے تحفظ کا پورا اہتمام کرتے ہوئے اجتہادی ذہن سے کام لینا ہے۔ اس کام کے لیے بڑی وسیع علمی استعداد اور بڑے اونچے درجے کی فنی مہارت کی ضرورت ہے۔ اس استعداد اور مہارت کی کمی پورا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہم اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ہر طرف سے جمع کریں۔ لیکن قوتوں اور صلاحیتوں کا مجتمع ہونا اور مختلف عناصر کا باہم دگر تعاون کرنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ کم سے کم اساسی نظریہ اور ملی نصب العین کی حد تک یک جہتی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ جماعت اسلامی کی دعوتی اور علمی سرگرمیوں کا ایک ہدف یہ بھی ہے کہ رجحانات اور آراء اور نقطہ ہائے نظر کے اختلافات کے باوجود نظریہ و مقصد کے لحاظ سے ساری قوم ایک ہو جائے۔

ہمارا مطالعہ یہ ہے کہ حقیقت پسند علماء اور متوازن ذہن کے جدید تعلیم یافتہ حضرات کی ایک اچھی خاصی تعداد اسی طرز پر سوچتی ہے۔

لیکن اجتہاد کا دروازہ کھولنے سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ قانونِ اسلامی کے عناصر ترکیبی اور ان میں سے ہر ایک کی مقصدیت اور قدر و قیمت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

انسان ہر حال میں ایک ایسے بنیادی قانون کا ضرورت مند ہے جس پر تمام تفصیلی اور جزئی ضوابط و احکام استوار ہو سکیں۔ جو مزید قانونی فیصلوں کے لیے ماخذ ہو اور جو سند اور معیار کا کام دے سکے۔ ہمارا بنیادی قانون ان قطعی اوامر و نواہی پر مشتمل ہے جو خدا نے اپنی کتاب اور اپنے رسولؐ کے ذریعے دیئے ہیں۔ اسے ہم الٰہی قانون کہتے ہیں۔ اس قانون کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہ کسی فرد، خاندان، طبقے یا قوم اور قبیلے کا بنایا ہوا نہیں ہے کہ اس میں کسی طرح کی جانب داری کا شبہ کیا جا سکے اور اس کے خلاف کوئی نسلی و وطنی تعصب کارفرما ہو۔ یہ ایک غیر جانبدار اور بے غرض و بے نیاز ہستی کا عطا کردہ ضابطہ ہے۔ اس ہستی کا غیر محدود علم ماضی اور مستقبل کو حاوی ہے اور انسانی دماغ کی کوتاہیوں سے پاک ہے۔ اُس ہستی کا نوعِ انسانی پر فطری اور منطقی حق یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ حکم دے اور اس کے حکم کو بے چون و چرا مانا جائے، کیونکہ وہ پیدا کرنے والا اور زندگی بھر کفالت کرنے والا ہے۔ ان وجوہ سے الٰہی قانون میں ایک انتہائی تقدس پایا جاتا ہے، اس کے لیے عقیدت و احترام کے جذبات کارفرما رہتے ہیں، اس کے موجب خیر و برکت اور ذریعۂ عدل و توازن ہونے پر پورا پورا اعتقاد اور بھروسہ پایا جاتا ہے اور اعتقاد، عقل اور افادیت کے سارے اعتبارات سے وہ رضاکارانہ پیروی کا مستحق بنتا ہے۔ یہ الٰہی قانون دراصل ہمارے لیے بنیادی میزانِ عدل اور افکار و اعمال کو جانچنے پرکھنے کی بے لاگ کسوٹی ہے۔ ہمارے پاس یہ ایک ایسا بنیادی ضابطہ ہے جو تمام حالات اور زمانوں میں جوں کا توں برقرار رہتا ہے اور خواہشات و جذبات کے انتہائی اشتعال اور مفاد و اغراض کے سخت ترین تصادم میں بھی کسی کی مجال نہیں ہو سکتی کہ اس کے اندر کوئی مداخلت کر سکے۔

انسان کے خود ساختہ قانونی نظاموں میں بڑی کمی یہ ہے کہ نہ انسان سے اعتماد و احترام کے وہ جذبات اپنے حق میں حاصل نہیں کر سکتے جو بدلتے حالات، جذباتی ہیجانات اور مفاد کے تصادم میں ان کا تحفظ کر سکیں۔ آدمی جب کبھی خواہشات، مفاد اور جذبات کے نرغے میں آتا ہے تو اپنے راستے سے وقت کے قانون کی حائل کردہ رکاوٹ کو دُور کرنے پر تُل جاتا ہے۔ چنانچہ انسانی قوانین ہمیشہ افراد اور طبقوں اور پارٹیوں کے اہواء و اغراض کا کھلونا بنے رہے ہیں۔ غیر اسلامی معاشروں کے پاس انسانی

قانون کے جو ترازو، وہ بٹے اور کسوٹیاں اور پیمانے پائے جاتے ہیں، اغراض وخواہشات کے ہاتھوں ان میں بار بار تصرف ہوتا رہتا ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے پاس ایسی میزان اور ایسے باٹ ہیں کہ دین کا تقدس واحترام کسی حال میں ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اپنے معاملات کو ان کے مطابق بنانے کے بجائے خود ان کو ادل بدل ڈالیں۔ اس "قانونِ الٰہی" کے تحفظ کے لیے اعتقاد وایمان، رائے عام اور حکومت وعدالت کی ساری طاقتوں کو برسرِ عمل رکھنا ہمارا اہم فریضہ ہے۔ وہ احکام، وہ حدود، وہ ہدایات، وہ فیصلے جو خدا ورسول کی طرف سے بہ حیثیت دین کے ہم کو سونپے گئے ہیں، ان پر ہم صرف اعتقاد واحترام کی نگاہ ڈال سکتے ہیں۔ تنقید کی نہیں۔ ان پر سمعنا واطعنا کہہ سکتے ہیں۔ ان میں مین میخ نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ان میں غور وفکر ہم جذبۂ اطاعت سے کر سکتے ہیں، اصلاح وتنسیخ اور ترمیم کرنے کے لیے نہیں! یہ قانونِ الٰہی تو وہ اساسی چٹان ہے جس پر اسلامی نظامِ قانون وفقہ کی ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اگر یہی متزلزل ہو جائے تو عمارت کہاں کھڑی رہ سکے گی۔

بدقسمتی سے اجتہاد کے فاسد تصور کے علمبردار اس بنیادی الٰہی قانون تک پر ہاتھ صاف کرنے کے ارمان رکھتے ہیں۔ ان کا طرزِ فکر یہ ہے کہ قرآن نے اکثر ضوابط وحدود ایسے بیان کیے ہیں جو عرب کے مخصوص تمدن اور دورِ نبوت کے مخصوص حالات سے متعلق تھے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اب ہم ان سارے ضوابط وحدود کا بوجھ پشت پر لادے رہیں۔ رہے ایسے اوامر ونواہی جن میں نسبتہً مستقل قدر وقیمت پائی جاتی ہے، سو ان کی تاویلات کا دائرہ وسیع ہے اور ہر دور کے مناسب حال ان کا کوئی نیا مفہوم معین کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے سامنے سے رسولِ خدا کی توضیحات وتعبیرات کی قطعیت کو ہٹا کر تاویل کی غیر محدود آزادی حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ اس آزادی کا مقصد یہ ہے کہ "تاویل کے دروازے" سے قرآن میں وہ وہ کچھ داخل کر دیا جائے جو اس کے اندر نہیں ہے۔ یہ سارا اہتمام بنیادی الٰہی قانون کو منسخ کر دینے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کو اندازہ نہیں کہ الٰہی قانون کے تقدس واحترام اور انسانی مداخلتوں سے اس کے بالاتر ہونے کی حیثیت کو اگر ایک بار نقصان پہنچا دیا گیا تو پھر اسلامی قانون کے نام سے جو کچھ لایا جائے گا اس کے لیے عقیدت واعتماد

اور قبول و اطاعت کے جذبات باقی نہ رہیں گے۔

ہمارے قانونی نظام کا دوسرا عنصر ترکیبی رسول اللہ کی سنت ہے۔ سنت دراصل بنیادی قانون کے تقاضوں اور اس کے مقاصد کو واضح کرتی ہے، عملی زندگی کے روزمرہ مسائل پر اس کے انطباق کا نہج معین کرتی ہے اور تعبیر و توضیح کا ایک رُخ بتاتی ہے۔ سنت بنیادی قانون کی تعبیر و توضیح کے معاملے میں انتشار کے امکانات کا سدباب کرتی ہے اور اختلافات کو جائز حدوں تک محدود کرتی ہے۔ سنت اُس یک رنگی و یکسانی کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہے جسے ہر قانونی نظام اپنے اندر قائم رکھنا چاہتا ہے۔ سنت اس منطقی ربط کو بھی برقرار رکھتی ہے جو قانون کے اصولیات سے لے کر اس کے باریک جزئیات تک میں پایا جانا چاہیے۔ قانونی نظاموں کی فطری ساخت ایک درخت کی سی ہوتی ہے جس کی جڑوں سے لے کر باریک کونپلوں تک سارے اجزا باہم دگر پیوستہ اور باہم دگر مؤثر و متاثر رہتے ہیں اور درخت کی مجموعی فطرت کے پابند رہ کر اپنا اپنا وظیفہ سرانجام دیتے ہیں۔ یہ سنّت ہی ہے جس کی برکت سے شریعت اسلامیہ کے شجرۂ طیبہ کے سارے اجزا ایک ہم آہنگ نظام میں مربوط رہ کر کام کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی جہالت پر سر دھنیئے جنہوں نے اس کے بالکل برعکس یہ پروپگنڈہ شروع کر رکھا ہے کہ سنت ہمارے قانونی نظام میں اختلاف و افتراق کا باعث بنی ہے۔ ان حضرات کو یہ موٹی سی حقیقت سجھائی نہ دے سکی کہ سنّت ماضی و مستقبل کا رشتہ ملاتی ہے اور تاریخ کے سارے ادوار کو جوڑ کر ایک کُل بناتی ہے اور سنت ہی ہے جو زمین کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے مسلمانوں میں فکری وحدت اور تمدنی ہم آہنگی برقرار رکھتی ہے[1]۔ اسی کوتاہ فہمی کے ساتھ یہ حضرات

---

[1] اس حقیقت کو جدید طبقے کے اندر سب سے بڑھ کر اور شاید سب سے پہلے اقبال نے سمجھا وہ مثنوی اسرار و رموز میں واضح کرتا ہے کہ ملت کا اجتماعی وجود قائم ہی نبوت کے فیضان سے ہے۔ فرد کی زندگی تو خدا پر ایمان لانے سے بن سکتی ہے۔ لیکن ملت کا ظہور نبوت کے وسیلے سے ہوتا ہے (باقی برصفحہ آئندہ)

اسلامی قانون کی اس ریڑھ کی ہڈی کو چور چور کرنے اٹھے ہیں۔ حالانکہ اگر سنت کا عنصر ایک بار کاٹ دیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نبی کی تربیت، نبی کا اسوہ، نبی کی سنت افراد کو باہم دگر مربوط کر کے اجتماعیت کے پیکر میں لاتی ہے۔ خدا کا رسول وہ مرکز ہے جس کے گرد اشخاص اور طبقے اور قومیں اور نسلیں سمٹ کر ایک وحدت کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ:-

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید — وز رسالت در تن ما جاں دمید
حرف بے صوت اندریں عالم بدیم — از رسالت مصرع موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوین ما — از رسالت دین ما، آئین ما!
از رسالت صد ہزار ما یک است — جزو ما از جزو ما لاینفک است
از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما

ان اشعار میں سنت کی اہمیت کا جو شعور مضمر ہے اسے ایک فتنہ زدہ دماغ شاید اخذ نہ کر سکے۔ لیکن اقبالؒ نے سنت نبی اور اطاعت نبی کی اہمیت کو "اسرار و رموز" میں بھی اور دوسرے مواقع پر بھی پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست — اصل "سنت" جز محبت ہیچ نیست
"تا شعار مصطفیٰ" از دست رفت — قوم را رمز بقا از دست رفت
مرشد رومی چہ خوش فرمودہ است — آنکہ یم در قطرہ اش آسودہ است
"مگسل از ختم الرسل ایام خویش — تکیہ کم کن بر فن و بر گام خویش"
از "مقام او" اگر دور ایستی — از میان معشر ما نیستی
دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم — زیں جہت با یکدگر پیوستہ ایم
رشتۂ ما یک تولایش بس است — چشم ما را کیف صہبایش بس است
شکوہ سنج سختی آئیں مشو — از "حدود مصطفیٰ" بیروں مرو

جائے تو ملتِ اسلامیہ کا شیرازۂ فکر تانا تا پریشان ہو کے رہ جائے گا اور اس جسمِ واحد کا ایک ایک ذرہ ہوا میں بکھر جائے گا۔ ایک زمانہ دوسرے سے اور ایک نسل دوسری نسل سے اور ایک وطن کے باشندے دوسرے وطن کے باشندوں سے ذہنی طور پر منقطع ہو جائیں گے اور نہ ہمارے نظام میں زمانی تسلسل باقی رہے گا، نہ عالمگیریت کی روح اس میں زندہ رہ سکے گی۔ قرآن سے سنت کا پہرہ اٹھ جانے کے بعد حسب ہوائے نفس کے تحت الٰہی قانون کی تعبیریں کی جانے لگیں گی تو کسی حکم اور کسی ہدایت کا کوئی مشترک مفہوم باقی نہ رہ سکے گا اور ہمارے مجتہدین

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار" "تا کمندِ تو کند یزداں شکار

معنیٔ دیدارِ آں "آخر زماں" حکمِ اُو بر خویشتن کردن رواں

در جہاں زی چوں رسولِ انس و جاں تا چو او باشی قبولِ انس و جاں

باز خود را بیں ہمیں دیدار اوست سنتِ او سِرّے از اسرار اوست

وہ "فلسفہ زدہ سید زادے" کو نصیحت کرتا ہے کہ "دل در سخنِ محمدی بند" وہ حضرت میاں میر کی تعریف میں کہتا ہے کہ "بر طریقِ مصطفیٰ محکم پئے"! وہ حضورؐ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ "آنکہ بے او طے نمی گردد سبل"۔ وہ ایک عالمِ دین کو ناقدانہ خطاب میں کہتا ہے کہ "بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست" اور ساتھ ہی انتباہ کرتا ہے کہ اگر یہ نہیں تو پھر جو کچھ ہے "بولہبی" ہے۔ اب یہ پرلے درجے کی ستم ظریفی ہے کہ اس اقبالؒ کو منکرِ حدیث اور مخالفِ سنت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں عائلی کمیشن نے اپنی سفارشات کے نظریاتی حصے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اقبالؒ محض "کتاب اللہ" کو سرچشمۂ قانون اور سند مانتے تھے۔ کیا ظلم ہے کہ "تشکیلِ جدید" سے ایک اقتباس لے لیا جاتا ہے اور ادھر اُدھر نگاہ نہیں جاتی کہ اقبالؒ نے آخر اور کیا کیا کچھ کہا ہے اور خصوصاً بعد میں اس کی فکر نے کیا مستقل شکل اختیار کی ہے۔ یہ ان حضرات کے طرزِ استدلال کی بنیادوں اور اس کے مسالے کا حال ہے۔

کے بجٹ اجتہادات میں سے کسی کا رُخ مغرب کی طرف ہوگا کسی کا مشرق کی طرف اور کسی کا شمال یا جنوب کی طرف، اور جس کا جدھر منہ اٹھے گا اُدھر بڑھتا چلا جائے گا۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ آخر سنت، رسول اللہ کے اجتہادات اور آپ کی تعبیرات اور آپ کے عدالتی نظائر ہی کا تو مجموعہ ہے۔ پھر کیوں ایک دور کے اجتہادات، تعبیرات اور نظائر کو دوام دے دیا جائے؟ ان لوگوں کو اندازہ نہیں کہ رسول کے اجتہادات و نظائر کو امت کے مقابلے میں کیا فوقیت حاصل ہے۔ رسول کے متعلق پہلی بات یہ طے ہے کہ شریعت کے علم اور مرضئ الٰہی کے شعور کے لحاظ سے کوئی دوسرا فرد یا گروہ، یا پوری امت مل کر بھی آپ کا مقام نہیں پا سکتی۔ دوسری بات یہ طے ہے کہ اخلاص اور دیانت و امانت اور بے لوث اور بے لاگ ہونے کے لحاظ سے بھی کوئی بڑے سے بڑا مومن و متقی آپ کے ہم پایہ نہیں ہو سکتا۔ تیسری بات یہ واضح ہے کہ آپ نے چونکہ خدا تعالیٰ کی وحی اور ہدایت اور نگرانی اور حفاظت خاص کے تحت کارِ دین سرانجام دیا تھا، لہٰذا آپ کے اجتہادات اور آپ کی تعبیرات اور آپ کے نظائر فساد اور خطا سے پاک ہیں۔ رسول اللہ نے علم و عصمت کی جس بلند ترین مسند پر سے خدا کی مرضیات اور اس کے احکام کو واضح کیا ہے اس پر چونکہ کوئی دوسرا بیٹھنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے حضورؐ کے قول و فعل پر خطِ تنسیخ پھیرنے اور اس کے مقابل میں کوئی نئی چیز پیش کرنے کا حق بھی کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر (نعوذ باللہ) رسولِ خدا کے علم و اخلاص پر سے کسی کا اعتماد ہی اٹھ گیا ہو اور وہ اپنے یا کسی اور کے علم و اخلاص کو ترجیح دیتا ہو تو ایسے بدبخت کے لیے سرے سے ملت اسلامیہ میں جگہ ہی کہاں ہوگی۔ سندِ اجتہاد تو بہت دُور کی چیز ہے وہ تو پورا دین ہی اپنے لیے الگ تصنیف کرے گا، اسے کیا پڑی ہے کہ وہ اسلام کے اندر اجتہاد کرنے بیٹھے۔

سنت کے بعد ہمارے قانونی نظام میں "اجماع" کی بڑی بھاری اہمیت ہے۔ "اجماع"

قانونی معاملات میں ان متفقہ فیصلوں کا اصطلاحی نام ہے جو ملت کے مختلف مدارس فکر کے ماہرین قانون کی توثیق و تائید سے وجود میں آئے ہوں۔ اس سلسلے میں اولیت کا مقام ان اجماعی فیصلوں کو حاصل ہے جو خلافت راشدہ کی مقدس فضا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست علمی و عملی تربیت پانے والے صحابہؓ نے طے کیے ہیں۔ یہ سارے اجماعی فیصلے جو پہلے ہو چکے ہیں اور جو آئندہ ہوں گے تعبیر و تاویل اور اجتہاد و استنباط کے میدان میں ایک دوسرے سے دور ہٹتے ہوئے اختلافی نقطہ ہائے نظر کو باہم دگر مربوط رکھنے کا وسیلہ ہیں۔ ان فیصلوں کے ذریعے جا بجا ایسے مرکزی نقاط قانون کے میدان میں معین ہو جاتے ہیں جن پر آکر مختلف مدارس فکر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ یہ چوراہوں پر لگے ہوئے نشانات اور سنگ ہائے میل کی طرح ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر کہ سلف کے اجماع کو خلف کا اجماع بدل سکتا ہے یا نہیں، اتنی بات مانے بغیر چارہ نہیں کہ اختلافی جزئیات کے مقابلے میں اجماعی فیصلوں کی اہمیت کئی گنا زیادہ ہے اور ان کے بارے میں غیر محتاط رویہ نہیں اختیار کیا جا سکتا۔ کسی اجماعی فیصلے سے تعرض کرنے سے پہلے بعد کے مجتہدین کو سو بار سوچنا پڑے گا۔ ورنہ اگر مختلف نقطہ ہائے نظر کا رشتہ ملانے والی ان گرہوں کو بے باکی سے کاٹ ڈالا جائے تو پھر تاویل و استنباط کے اختلافات بلا نہایت ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ نتیجہ انتشار ہو گا۔

اجماعی فیصلوں سے نیچے اتر کر قانونی معاملات میں نظائر (PRECEDENTS.) کی بھی خاصی اہمیت ہے۔ اس اہمیت کو سمجھنے کے لیے قانونی نظام کی فطرت کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ قانون انقلابی جست نہیں لگایا کرتا بلکہ تدریجی طور پر نشوونما پاتا ہے۔ وہ اصولوں سے فروعات اور کلیوں سے جزئیات پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک درخت کی طرح ٹہنوں سے چھوٹی شاخیں اور شاخوں سے کونپلیں اور کونپلوں سے پتیاں نکالتا رہتا ہے۔ اس کا ارتقا ایک تدریجی تسلسل رکھتا ہے۔ اس میں ہر نئی چیز کسی اصول سے اخذ ہوتی ہے اور مجموعی نظام میں

اسے ایسی جگہ بنا کے دینی پڑتی ہے کہ نہ تو اس سے کوئی اصول مجروح ہو اور نہ دوسرے جزئیات سے وہ ٹکرائے۔ ہر نئے جزئیے کو مجموعی ڈھانچے سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اور اس منطقی رابطے کے اندر کھپ جانا چاہیے جو نظامِ قانون کا لازمہ ہے۔ قانون میں نئے جزئیات بالکل اسی طرح رونما ہوتے ہیں جیسے درخت اپنے اندر سے اپنی ضرورت کی نئی پتیاں اپنی مخصوص ساخت کے ساتھ نکالتا رہتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر اس کی اپنی پتیاں نوچ کر کسی اجنبی درخت کی پتیاں اس کی ٹہنیوں کے ساتھ لا لا کر باندھی جانے لگیں یا اس کی شاخ تراشی کر کے بے جوڑ قسم کی شاخیں اس کے تنے پر اڑس دی جائیں تو وہ سارے کا سارا تباہ ہو کے رہ جائے گا۔ اس طرح بے جوڑ اصول و مقاصد اور اجنبی قسم کے جزئیات اگر کسی قانونی نظام میں زبردستی ٹھونس دیئے جائیں تو وہ اس کے پورے ڈھانچے کا ستیاناس کر کے رکھ دیں گے۔ قانون کے مزاج کی یہی خصوصیت ہے جو نظائر کی اہمیت پیدا کرتی ہے۔ علمائے قانون، جج اور قاضی، مفتی اور وکلاء کوئی فیصلہ دینے اور رائے قائم کرنے سے قبل پیچھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اب تک قانون نے کیا کیا سنگ ہائے میل نصب کیے ہیں اور کیا کیا نقوش پا ثبت کیے ہیں۔ پچھلے نظائر سے بے نیاز ہو کر قانون میں اندھا دھند رائے دینے اور فیصلے کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ بے جوڑ اور باہم دگر متصادم فیصلوں اور آراء کو اپنے اندر جمع کرے اور اس کا ارتقائی تسلسل اور اس کا منطقی ربط بالکل تباہ ہو کے رہ جائے۔ علاوہ بریں کسی قانونی نظام کو جو معاشرہ لے کے چل رہا ہوتا ہے اس کے اندر اپنے ہاں کے قانونی روایات و نظائر سے ایک ذہنی وابستگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ وابستگی مسلمانوں کے اندر قانونِ شریعت کے لیے زیادہ گہری قسم کی ہے۔ معاشرے کے تاثرات کا لحاظ کیے بغیر اگر کچھ لوگ قانونِ شریعت کا سارا ڈھانچہ مسخ کر دینے والے انوکھے فیصلے کرنے پر اتر آئیں تو ان فیصلوں کو عملاً قبول کون کرے گا اور یہ نافذ کن لوگوں پر کیسے جا سکیں گے۔ قانون میں اب تک جو فکری ارتقاء ہوا ہے اور ملت کے معتمد علیہ ائمہ و مفکرین نے عرق ریزیوں کا جو علمی حاصل ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

اور جس کے استدلال کے ساتھ پوری پوری سازگاری ہمارے اجتماعی ذہن نے پیدا کر لی ہے، اسے پاؤں تلے روند کر ایک نئی شریعت گھڑنے پر کون ہوگا جو "متحرک اسلام" کے مجتہدین کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ بالکل ناگزیر ہے کہ نئے فیصلے کرنے سے قبل پچھلے فیصلوں کا باریکی سے جائزہ لیا جائے اور کسی نئی بات کو سامنے لانے سے قبل یہ اطمینان کر لیا جائے کہ قانون کے مجموعی ڈھانچے سے یہ ہم آہنگ ہو سکے گی یا نہیں۔ قانون اپنے ارتقاء میں جس تدریجی تسلسل اور جس منطقی ربط کو چاہتا ہے اسے برباد کر دینے کا نام اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ ایسا اجتہاد تو اس کی جڑیں کھود کے رکھ دے گا۔

مختصر یہ کہ کسی بھی قانونی نظام میں اجتہاد بچوں کا کھیل نہیں ہوتا کہ ہر تیز دماغ قلم رساں اس کی مسندِ جلیلہ پر جلوہ فرما ہو جائے، کجا کہ معاملہ شریعتِ اسلامی کا ہو جس کے ساتھ کروڑوں بندگانِ خدا کی دنیا بھی اور آخرت بھی بندھی ہوئی ہے۔ اس منصب پر آنے کے لیے کسی خاندان یا نسل یا طبقے سے نسبت کی ضرورت نہیں، لیکن قانون کے تمام عناصر، تمام اصول اور تمام اجزاء اور ان کے باہمی ربط کی ماہرانہ بصیرت ضرور درکار ہے۔ اجتہاد سے پہلے اکتساب کی ضرورت ہے۔ اگر امریکہ کی عظیم ایٹمی تجربہ گاہ میں ہر اناڑی کو گھومتے پھرنے اور مداخلت کرنے کا حق دے دیا جائے تو جتنا بُرا نتیجہ اس حماقت سے رُونما ہوگا اس سے ہزار گنا زیادہ بُرا نتیجہ شریعتِ اسلامیہ کے پیچیدہ اور باریکی دار نظام میں ان کھلنڈرے ذہنوں کو طبع آزمائی کا اذن دے دینے سے شریعت اور ملت کے حق میں رونما ہو سکتا ہے۔

اجتہاد کے لیے بہرحال معتمد علیہ شخصیتوں کی ضرورت ہے۔ اسی لیے ہمارے علومِ قانونیات میں مجتہد کے لازمی اوصاف اور شرائطِ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے بحثیں کی گئی ہیں۔ ان بحثوں کا اگر اصل مغز سامنے رکھا جائے تو اجتہادی فیصلے صرف ایسے لوگوں کے ذریعے ہونے چاہئیں جو حسبِ ذیل پہلوؤں سے ملت کا اعتماد حاصل کر سکیں:۔

—— ان کی علمی استعداد کے بارے میں یہ اطمینان پایا جانا چاہیے کہ یہ قانونِ شریعت کے پورے سسٹم کو جڑ سے لے کر کونپلوں تک سمجھتے ہیں اور ان کا باہمی ربط جانتے ہیں اور پیش آمدہ مسائل میں ماہرانہ رائے دے سکتے ہیں۔

—— ان کے کردار کے بارے میں عوام کو یہ بھروسہ ہونا چاہیے کہ یہ خدا ترس اور با اخلاص اور دیانت دار لوگ ہیں، ان کے اندر دین اور اس کے قانون سے انحراف کا جذبہ کارفرما نہیں ہے، یہ شریعت کے اندر اپنی اغراض و اہواء کو دخیل کرنے والے نہیں ہیں اور ان کے کچھ اپنے طبقاتی اور گروہی تقاضے ایسے نہیں ہیں کہ جن کو یہ خدا اور رسول کا نام لے کر اجتہاد کے عنوان سے ہمارے سر منڈھ دیں۔

—— ان کی ذہنی و فکری ساخت کے بارے میں عام مسلمانوں کے اندر یہ اندیشہ موجود نہ ہونا چاہیے کہ وہ کسی غیر اسلامی فکر و تہذیب سے مرعوب اور کسی کافرانہ نظام قانون کے مفتوح ہیں اور وہ اجتہاد کی مسند پر بیٹھ کر شریعت کے ڈھانچے میں اجنبی اور متضاد نظریات، اصول اور جزئیات کو داخل کر دیں گے اور اسلامی قانون میں تحریف کر ڈالیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ منصب اجتہاد کے لیے ایسے دل و دماغ کو کوئی بھی قانونی نظام —— اور علی الخصوص اسلام —— موزوں اور اہل قرار نہیں دے سکتا جو اغیار کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو۔ ذہنی غلامی اور اجتہاد میں باہمی منافات ہے۔ کہنے والے نے خوب کہا کہ "محکوم کے الہام سے اللہ بچائے"۔ کہنا چاہیے کہ اغیار کے ذہنی غلاموں کے اجتہاد سے اللہ بچائے۔

ان صفات سے عاری لوگ اگر اجتہاد کی مسندوں پر بیٹھنے لگیں —— چاہے یہ مسندیں کسی کمیشن کے نام سے حکمراں پارٹی نے اپنے دستِ مبارک سے کیوں نہ بچھائی ہوں —— تو عوام ان کے کیے ہوئے کام سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے اور نہ وہ ان قانونی تبدیلیوں کو شرح صدر سے قبول کر سکتے ہیں جو ایسے غیر معتمد مجتہدین نے تجویز کر کے دی ہوں۔ ان کے کارناموں کو ہمیشہ شک و شبہ سے دیکھا جائے گا اور ان کی مداخلتوں کو لازماً دین میں مسخ اور تحریف کا ہم معنی سمجھا جائیگا۔

قانونِ شریعت کی مقدس اور پیچیدہ مشینری کو متحرک کرنے کا کام کبھی ایسے لوگوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا جن کی معلومات عامیانہ درجے کی ہوں، جن کی پوری عملی زندگی اسلام کے تقاضوں سے بغاوت اور فرار کی شہادت دے رہی ہو، جن کے بارے میں یہ بات معلوم عام ہو کہ وہ غیر اسلامی فکر و تہذیب کے سامنے مفتوح ہو چکے ہیں اور باہر سے لا لا کر اجنبی چیزوں کو اسلام کے ڈھانچے میں نصب کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ اور جن کے نرالے تصورِ اسلام کو ملتِ اسلامیہ کا اجتماعی ذہن قبول نہیں کر سکتا۔[۱]

صحیح طریق کار یہ ہے کہ ہم اپنے اندر سے ایک طرف ایسے معتمد علیہ علماء کو لیں جو اسلامی قانون کے ماہرانہ علم کے ساتھ جدید حالات و ضروریات کا شعور رکھتے ہوں اور دوسری طرف

---

[۱] یہی وجہ ہے کہ دورِ زوال و فساد میں جبکہ اسلامی نظام برطرف ہو گیا ہو اور غلط قسم کی قیادت برسرِ اقتدار آ جائے اور دین و شریعت کے معاملات غیر ذمہ دار ہاتھوں میں چلے جائیں، علماء کی ایک بڑی تعداد نے اجتہاد کے دروازے کا بند رکھا جانا لازم قرار دیا ہے۔ ان کے استدلال میں اتنا وزن تھا کہ علامہ اقبال مرحوم نے بھی اسے قبول کر لیا، وہی اقبالؒ جو "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں اجتہاد کا نہایت جھلک اور خطرناک تصور پیش کرتا ہے، مثنوی اسرار و رموز میں تلقین کرتا ہے کہ:

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط ‏ ‏ قوم را برہم ہمی پیچد بساط

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر ‏ ‏ اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است ‏ ‏ معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است

آج جو مدعیانِ اجتہاد "تشکیلِ جدید" کے اقتباسات استعمال کر رہے ہیں ان سے درخواست ہے کہ وہ ذرا اس "رجعت پسند" اور "ماضی پرست" اقبالؒ کو بھی پڑھیں جس نے پختگیٔ فکر کے مقام تک آتے آتے تشکیلِ جدید کے اکثر مباحث کی خود ہی تردید کر دی ہے۔ ان حضرات نے اقبال کی اسی ایک کتاب کو آخر کیوں اپنے لیے چراگاہ بنا لیا ہے۔

جدید تعلیم یافتہ طبقے میں سے ایسے مخلص افراد کو چھانٹ لیں جو دورِ حاضر کے مسائلِ حیات کا تحقیقی مطالعہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلام سے وفاداری رکھتے ہوں اور کم سے کم اسلامی قانون کے عناصر ترکیبی اور ان کے باہمی ربط اور ان میں سے ہر ایک کی قدر و قیمت کو جانتے ہوں۔ دونوں صنفوں میں سے وہی لوگ اس نازک فریضہ کو سرانجام دینے کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں جو انتہا پسندانہ ذہن کے ساتھ باہم دگر نفرت اور کشمکش رکھنے کے بجائے ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے سے تعاون کرنے کے اہل ہوں۔ بروئے دستور جو کمیشن موجودہ قانونی نظام کو اسلام کے مطابق بدلنے کا منصوبہ بنانے کے لیے مامور کیا جانے والا ہے، اس کے ارکان کا انتخاب کرنے میں اگر اسی معیار کو سامنے رکھا جائے تو نہایت اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ صدرِ ریاست سے ہم اس غلطی کی توقع نہیں کرتے جو عائلی کمیشن کی ترتیب میں کی جا چکی ہے اور جس کے زریں کارنامے پر سارا ملک نفرین بھیج رہا ہے۔

عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ

از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

اگست ۱۹۵۵ء میں ہماری مرکزی حکومت نے سات افراد پر مشتمل ایک کمیشن بنھایا تھا جس کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا تھا کہ وہ نکاح، طلاق اور کفالت وغیرہ سے متعلق موجودہ قوانین کا جائزہ لے کر بتائے کہ کیا عورت کو معاشرہ میں اس کی اصلی جگہ دلانے کے لیے ان میں کسی ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے، نیز وہ نکاح و طلاق کی رجسٹری، طلاق بذریعہ عدالت اور ازدواجی امور سے متعلق خاص عدالتوں کے قیام کے متعلق بھی اپنی رایوں کا اظہار کرے۔

اس کمیشن کے صدر خلیفہ شجاع الدین مرحوم بنائے گئے تھے اور ارکان میں مندرجہ ذیل حضرات تھے:

۱۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب،

۲۔ مولانا احتشام الحق صاحب،

۳۔ مسٹر عنایت الرحمٰن،

۴۔ بیگم شاہنواز،

۵۔ بیگم انورجی احمد،

۶۔ بیگم شمس النہار محمود

کمیشن کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد خلیفہ شجاع الدین صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس وجہ سے صدارت کے لیے ان کی جگہ پر میاں عبدالرشید صاحب سابق چیف جسٹس پاکستان کا انتخاب عمل میں آیا۔

اس کمیشن نے اپنی رپورٹ مرتب کر کے حکومت کے حوالہ کر دی ہے اور حکومت کی طرف سے ۲۰ جون ۱۹۵۶ء کے سرکاری گزٹ میں شائع ہو گئی ہے۔ کمیشن کے ارکان میں سے مسٹر عنایت الرحمٰن صاحب نے

کمیشن کی کارروائیوں میں، اگرچہ عملاً کوئی حصہ نہیں لیا لیکن اس رپورٹ کو ان کی منظوری حاصل ہے۔ مولانا احتشام الحق صاحب نے اس پر کوئی اختلافی نوٹ لکھا ہے لیکن وہ اس رپورٹ کی اشاعت کے وقت تک موصول نہیں ہوا تھا اس وجہ سے وہ اس میں شامل نہیں ہے۔ اس کے متعلق وعدہ کیا گیا ہے کہ موصول ہوتے ہی ایک ضمیمہ کی حیثیت سے اس کو شائع کر دیا جائے گا۔ اس طرح یہ رپورٹ علامہ صاحب صدر کے علاوہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب اور مذکورہ تینوں بیگمات کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

رپورٹ کی اہمیت | یہ رپورٹ مختلف اعتبارات سے بڑی اہمیت رکھتی ہے: جن میں سے بعض کی طرف میں یہاں اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس رپورٹ میں جو سفارشات پیش کی گئی ہیں وہ اگر منظور ہو جائیں تو ہماری معاشرتی زندگی کا موجودہ ڈھانچہ یک قلم تبدیل ہو جائے گا۔ وہ ساری اساسات بھی اس تبدیلی کے نتیجے میں ختم ہو جائیں گی جن پر اسلام نے ہمارے معاشرتی نظام کو قائم کیا ہے اور وہ ساری روایات بھی (عام اس سے کہ وہ غلط ہیں یا صحیح) ختم ہو جائیں گی جن کا عام طور پر احترام کیا جاتا رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس رپورٹ کی منظوری ہمارے معاشرہ کے کسی ایک ہی طبقہ کو متاثر نہیں کرے گی بلکہ اس کے تلخ و شیریں نتائج میں سے اس ملک کا ہر شہری حصہ پائے گا: عام اس سے کہ وہ امیر ہو یا غریب۔ شہری ہو یا دیہاتی، متمدن ہو یا وحشی، عورت ہو یا مرد، نیک ہو یا بد، بلکہ سچ پوچھیے تو اس کے دوررس نتائج کی زد سے وہ چھوٹے یا بڑے ادارے بھی نہ بچ سکیں گے جو آپ کے معاشرے کی مختلف ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ یہاں تک کہ آخری نتیجے کے طور پر اس سے ہماری ریاست بھی اس سے ایک بالکل ہی مختلف ہیولیٰ اختیار کرے گی جو ہمارے نئے دستور نے اس کا پیش کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس رپورٹ کے مرتبین نے ہمیں کچھ نئے نظریات اور نئے اصولِ اجتہاد دیئے ہیں جن سے ہم بالکل پہلی مرتبہ آشنا ہوئے ہیں۔ سابق ائمہ و مجتہدین سے ہمیں جو کچھ ورثہ میں ملا ہے اس کے پورے ذخیرہ میں ہمیں ان نظریات اور ان اصولوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ یہ اصول اگر تسلیم کر لیے جائیں (اور اس رپورٹ کے تسلیم کر لینے کے معنی یہی ہیں کہ ہم نے ان کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا) تو نہ صرف ہمارا وہ پورا

دینی ذخیرہ ایک دفتر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جو بارہ تیرہ سو سال میں مرتب ہوا ہے بلکہ سرے سے قرآن و حدیث بھی ایک لایعنی شے بن کے رہ جاتے ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ دستور کے نفاذ کے بعد یہ بالکل پہلی چیز ہمارے سامنے آئی ہے جس سے اس اسلامی زندگی کا کچھ آئیڈیا ہوتا ہے جو ہمارے ملکی اکابر اور ان کے ہم رنگ و ہم مشرب حضرات کے ذہنوں میں ہے۔ نیز دستور میں یہ جو ضمانت دی گئی ہے کہ اس ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے، جو غیر اسلامی قوانین یہاں جاری ہیں وہ اسلامی قوانین سے بدلے جائیں گے، ایک کمیشن بیٹھے گا جو ان قوانین کو مرتب کریگا اور ان کے نفاذ و اجرا کے لیے اقدامات و مراحل تجویز کرے گا، یہ ساری چیزیں کس طرح واقع ہونگی اور یہ وعدے عملی جامہ کس طرح پہنیں گے؟ ان سوالوں کا جواب بڑی وضاحت سے یہ رپورٹ دیتی ہے۔

یہ سارے پہلو اس بات کے متقاضی ہیں کہ اس رپورٹ کو محض سرسری نظر سے دیکھکر اس کو آگے کے مراحل سے گزر جانے کے لیے چھوڑ نہ دیا جائے بلکہ اس کی ایک ایک چیز کو اچھی طرح تجزیہ کر کے سمجھا جائے اور اگر یہ فی الواقع انہی نتائج کی حامل ہے جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے تو اس فتنہ کے سدباب کی تدبیریں کی جائیں۔ آخر یہ نتائج ہمارے ہی سامنے آنے ہیں کسی اور کے سامنے نہیں آنے ہیں۔

ان گوناگوں اہمیتوں کے پیش نظر میں اس رپورٹ پر مفصل تبصرہ کرنا چاہتا ہوں یہ تبصرہ چار مختلف پہلوؤں سے ہوگا۔ پہلے میں پیش نظر مقصد کے لحاظ سے اس کمیشن کی تشکیل کی نوعیت پر کچھ روشنی ڈالوں گا۔ اس کے بعد یہ بتاؤنگا کہ ہمارے موجودہ دستور کی رو سے اس کمیشن کی حیثیت کیا ہے؟ پھر ان جدید نظریات اور اجتہاد کے ان نئے اصولوں پر تبصرہ کروں گا جو اس رپورٹ کے ذریعہ سے بالکل پہلی مرتبہ ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس کے بعد وضاحت کے ساتھ ان سفارشات کو زیر بحث لاؤنگا جو کمیشن نے پیش کی ہیں اور یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ یہ سفارشات کتاب و سنت اور حالات و مصالح سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہیں اور اگر یہ منظور ہو جائیں تو ان سے کن نتائج کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

لیکن یہ بحث نامکمل رہے گی اگر اس تبصرے کو تبصرہ ہی کی حد تک محدود رکھا جائے۔ اس تبصرہ سے یہ تو ممکن ہے کہ رپورٹ کی خامیاں اور غلطیاں سامنے آجائیں لیکن صرف اتنے سے اصل مسئلہ حل نہیں

ہوتا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے موجودہ عائلی نظام میں بہت سی خرابیاں گھس آئی ہیں جو ان پاکیزہ اصولوں اور ان پاکیزہ تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں جن پر اسلام نے ہمارے عائلی نظام کو قائم کیا تھا۔ اس وجہ سے اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ سفارشات اسلام کے خلاف ہیں تو ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم وہ صحیح تدابیر بھی بتائیں جن سے موجودہ خرابیوں کی اصلاح ہو سکے۔ چنانچہ میں آخر میں وہ تدابیر بھی بتاؤں گا جو موجودہ خرابیوں کو دور کر سکتی ہیں۔

پیش نظر مقصد اور کمیشن اس کمیشن کے قیام کا مقصد، جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے، ہمارے موجودہ عائلی قوانین کا جائزہ لے کر یہ بتانا تھا کہ عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے ان قوانین میں کسی ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے؟ اور اگر ضرورت ہے تو کس قسم کی اصلاح کی ضرورت ہے؟

ہر شخص جانتا ہے کہ یہ عائلی قوانین کم و بیش وہی ہیں جو انگریزوں نے محمڈن لا کے نام سے اپنے زمانۂ حکومت میں (غالباً ۱۷۷۲ء میں) جاری کیے تھے۔ اس ملک میں چونکہ حنفی المذہب مسلمانوں کی اکثریت تھی اس وجہ سے قدرتی طور پر یہ محمڈن لا فقہ حنفی پر مبنی ہوا اور اس کے لیے وہی کتابیں ماخذ بنیں جو حنفیوں کے نزدیک معتبر خیال کی جاتی تھیں۔ مثلاً ہدایہ، فتاویٰ عالم گیری اور سراجی وغیرہ[1]۔ ان کتابوں کے خود انگریزوں ہی نے اپنے اہتمام میں ترجمے کرائے اور بحث و استدلال اور عدالتی فیصلوں میں یہی کتابیں حوالہ کی کتابوں کی حیثیت سے مستند و معتبر تسلیم کی گئیں۔

کمیشن کے فاضل ارکان کے نزدیک یہ انگریزوں کی ایک چال تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کو محمڈن لا کے ساتھ باندھ کر رکھ دیا جس کے سبب سے ان کی سوسائٹی بالکل جامد ہو کر رہ گئی اور بدلتے ہوئے حالات کے قدم بقدم اس کو تبدیل ہونے اور ترقی کرنے کا موقع نہ مل سکا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

> "رومیوں کی طرح انگریزوں نے بھی مختلف مذہبی گروہوں کے پرسنل لا میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت مسلمانوں میں ان قوانین کو جاری کیا گیا جو اینگلو محمڈن لا کے نام سے موسوم ہیں۔ اسلامی قانون جس کا اجرا اس شکل میں شروع ہوا وہ ترقی پذیر حالات اور زمانے کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ دینے والا ذی روح وجود نہ رہا تھا۔ مسلمانوں کے لیے پرسنل لا کے نام سے جو

[1] شیعوں کے لیے غالباً کتاب شرائع الاسلام۔

پہلے اختیار کی گئی تھی وہ بالکل دقیانوسی، جامد اور مختلف اعتبارات سے غیر واضح تھی لیکن سیاسی غلامی کے سبب سے اس کی اصلاح یا تجدید ناممکن تھی"۔ (گزٹ آف پاکستان صفحہ ۱۲۰۳)

میں یہ بات سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ کمیشن کے فاضل ارکان کو انگریزوں پر کس بات کا غصہ ہے؟ کیا اس بات کا کہ جب انھوں نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے ترقی پسندانہ قوانین کے تحت کر دیا تھا تو یہ ذرا سا تسمہ پرسنل لا کا کیوں لگا چھوڑ دیا، اس کی جگہ پر بھی اپنے ہی ترقی پسندانہ قوانین کیوں جاری کر دیئے کہ اس دقیانوسی اور جامد قانون کا ہمیشہ کے لیے قصہ ہی پاک ہو جاتا؟ یا اس بات کا کہ انھوں نے ہدایہ اور عالمگیری اور سراجی جیسی دقیانوسی کتابیں کیوں عدالتوں کے ہاتھوں میں پکڑا دیں، کیوں چند ترقی پسند بیگمات اور کسی خلیفہ عبدالحکیم پر مشتمل ایک کمیشن بٹھا کر ان کتابوں میں اصلاحات اور ترمیمات کرائیں؟ یا اس بات پر ان فاضل ارکان کو غصہ ہے کہ انگریزوں نے رومیوں کی اندھی تقلید میں مختلف مذہبی گروہوں کے پرسنل لا کی حفاظت کی دقیانوسی پالیسی پر کیوں عمل کیا، کیوں نہ اس فرسودہ پالیسی ہی کا خاتمہ کر دیا کہ سب کے سب ایک ہی ساتھ ڈوبتے اور ایک ہی ساتھ ترتے؟

میرے نزدیک ارکان کمیشن کا یہ غصہ جس سبب سے بھی ہو، بالکل بیجا ہے۔ انگریزوں سے زیادہ اس بات کا کوئی شائق نہیں تھا کہ وہ ہماری زندگی کے ہر گوشے اور ہر شعبے کو بالکل مغربی رنگ میں رنگ دیں (اور اگر وہ رنگ دیتے تو اس میں تو شبہ نہیں کہ آج ہمارے اس کمیشن کا کام بڑا آسان ہو جاتا بلکہ شاید اس طرح کے کسی مقصد کے لیے کسی کمیشن کے بٹھانے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی، جس منزل پر پہنچنے کے آج ہم ارمان رکھتے ہیں اس پر آج سے بہت پہلے ہم پہنچ چکے ہوتے) لیکن انگریز اس ملک پر حکومت کرنا چاہتے تھے اس وجہ سے وہ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ وہ پرسنل لا کی نزاکتوں کو سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم نے جن لوگوں کا ملک چھینا ہے وہ اس صدمہ کو تو شاید کچھ عرصے کے بعد بھول جائیں لیکن اگر ہم نے ان کے پرسنل لا کو بھی قانون کے زور سے بدلنا چاہا تو پھر یہ ہم کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔

پرسنل لا کسی قوم کی آخری متاع ہوتی ہے جس کے لٹ جانے کے بعد وہ قوم بالکل ہی بے مایہ

ہو جاتی ہے۔ سب کچھ کھو دینے کے بعد بھی اگر کسی قوم کا پرسنل لا باقی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا تشخص ابھی باقی ہے اور جب تک تشخص باقی ہے تو گویا اس کی ہستی بھی قائم ہے۔ لیکن اگر یہ بھی باقی نہ رہا تو گویا اس کی ہستی ہی سرے سے ختم ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنے پرسنل لا کی حفاظت کے لیے اپنا آخری زور لگا دیتی ہے اور بسا اوقات اس کے لیے سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر مغرور سے مغرور فاتحوں اور مستبد سے مستبد حکمرانوں نے بھی اپنی رعایا کے پرسنل لا کا احترام کیا۔ رومیوں نے اگر احترام کیا تو اس کی وجہ، جیسا کہ کمیشن کے فاضل ارکان نے سمجھی ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے محکوموں کے معاشرہ کو جامد دیکھنا پسند کرتے تھے اور اگر انگریزوں نے ہمارے پرسنل لا کا احترام کیا تو اس کی وجہ بھی یہ نہیں تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم ہدایہ اور عالمگیری ہی کے چکر میں رہیں، ان سے باہر نہ نکل سکیں، بلکہ اس کی وجہ وہی ہے جو عرض کی گئی۔ وہ اس رمز سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ اپنے پرسنل لا کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی مذہبی اور جذباتی ہے۔ وہ اس کو چھیڑ کر کوئی فائدہ تو اٹھا نہ سکیں گے البتہ اپنے اقتدار کے لیے جس کی جڑیں ابھی مستحکم نہیں ہوئی تھیں، ایک بہت بڑا خطرہ مول لے لیں گے۔ بھارت میں جہاں مسلمانوں کو جان و مال کا تحفظ بھی حاصل نہیں ہے، دستور کی حد تک ہی سہی، ان کا پرسنل لا محفوظ ہے۔ خود ہم نے اپنے دستور میں پاکستان کے اندر بسنے والی اقلیتوں کے پرسنل لا کے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔ کیا یہ ضمانت ہم نے اس خیال سے دی ہے کہ ان کا معاشرہ جامد رہے اور وہ تجدد کی منزلیں طے نہ کر سکیں یا اس لیے دی ہے کہ آج ہر نظام میں خواہ دینی ہو یا لادینی اس کے احترام کو اس وجہ سے ضروری قرار دے دیا گیا ہے کہ لوگوں کے احساسات اس بارے میں نہایت نازک ہوتے ہیں اور اس میں کسی مداخلت کو لوگ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتے۔

ارکان کمیشن کا یہ خیال بھی بالکل غلط ہے کہ انگریزوں نے پرسنل لا کے نام سے جو چیز اختیار کی وہ دقیانوسی، فرسودہ اور جامد تھی۔ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ محمڈن لا کی بنیاد ہدایہ، عالمگیری اور معاملات میراث میں سراجی پر ہے۔ یہ اسلامی قانون کی وہ کتابیں ہیں جو اس حکومت میں قضا اور فتوے کی بنیاد رہ چکی تھیں جس کی جگہ انگریزوں نے لی تھی اس وجہ سے قدرتی طور پر جب انگریزوں نے پرسنل لا کی حد تک

اسلامی قوانین کو باقی رکھنا چاہا تو وہ انہی کتابوں پر اعتماد کرنے پر مجبور ہوئے جن پر مسلمانوں کو پہلے سے اعتماد تھا۔

ان کتابوں کو آج آپ جو چاہیں گالیاں دے لیں آپ کو کوئی روک نہیں سکتا لیکن جس زمانہ میں انگریزوں نے ان کتابوں کو محمڈن لاء کی اساس کی حیثیت سے اختیار کیا تھا اس زمانے میں کوئی شخص ان کی نسبت وہ الفاظ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا جو آج کہے جا رہے ہیں۔ ہدایہ آج بھی فقہ حنفی کی امہات میں شمار ہوتی ہے اور اسلامی قانون کا کوئی طالب علم اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ کمیشن کے ارکان کی نسبت تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس سے واقف ہیں یا نہیں لیکن کمیشن کے فاضل صدر کی نسبت میں یہ گمان رکھتا ہوں کہ وہ کم از کم ہملٹن کے ترجمے کے واسطہ سے اس سے واقف ہونگے اور اس کے بارے میں ہملٹن کی رائے سے بھی بے خبر نہیں ہونگے۔ ہماری قوم میں جسٹس محمود جس پایہ کے قانون دان گذرے ہیں اس پایہ کا کوئی دوسرا قانون دان نہ گزرا اور نہ آج بدقسمتی سے کوئی موجود ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی نسبت جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ بھی پاکستان کے سابق چیف جسٹس سے مخفی نہیں ہو سکتے۔ فتاوائے عالمگیری کا حال یہ ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی تصنیف نہیں ہے بلکہ گیارھویں صدی ہجری میں اس کو مرتب کرنے کے لیے سلطان محمد اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے پورے ملک کے مشہور و مستند علماء کا ایک بورڈ قائم کیا تھا اور اس بورڈ نے یہ مقصد پیش نظر رکھ کر اس کو مرتب کیا تھا کہ یہ مغلیہ سلطنت کی عدالتوں کے لیے ایک مدون ضابطہ کی حیثیت سے کام دے۔ اگرچہ پیش نظر مقصد کے لحاظ سے یہ کتاب نئے اسلوب پر تو مدون نہ ہو سکی تاہم یہ برابر فقہ حنفی کے ایک معتبر ترین مجموعے کی حیثیت سے حکام اور مفتیوں دونوں کا مرجع رہی ہے۔ یہی حال سراجی کا ہے۔ کم از کم میراث کے مسائل میں اس سے زیادہ مرتب، مختصر اور مستند کتاب آج بھی کوئی موجود نہیں ہے۔ بہرحال انگریزوں نے جو محمڈن لاء جاری کیا اس کی بنیاد انہی کتابوں پر تھی اور یہ کتابیں فقہ حنفی کی آج بھی معتبر و مستند کتابیں ہیں۔

مجھے اس امر سے انکار نہیں ہے کہ انگریزوں نے جو محمڈن لا جاری کیا وہ بعض اعتبارات سے ناقص تھا اور جن کتابوں سے اخذ کردہ مواد پر یہ مبنی تھا وہ کتابیں بھی جانچنے پرکھنے کی محتاج ہیں۔ بہت اچھا ہوتا اگر پہلے ہی کتاب و سنت کی کسوٹی پر اس کو پرکھنے اور اس کے صحیح و سقیم میں امتیاز کرنے کی کوشش کی گئی ہوتی اور

اگر پہلے یہ کوشش نہیں کی گئی تو اب تو نہایت ضروری ہے کہ اس سارے محمڈن لا کو ازسرِ نو جانچ کر اس کو براہِ راست کتاب و سنت کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اس میں تغیر اور اصلاح کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ اعتراض اگر ہے تو اس بات پر ہے کہ اس کام کے لیے جو کمیشن بٹھایا گیا وہ اس اہم اور نازک کام کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں تھا۔ یہاں پیشِ نظر کام یہ نہیں تھا کہ انگریزوں نے محمڈن لا کے نام سے ہمارے عائلی نظام کے لیے کچھ ضابطے جاری کر رکھے تھے جو فرسودہ اور کہنہ ہو چکے تھے، جن ہماری سوسائٹی کی ترقی رکی ہوئی تھی ان کو موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ قوانین سے بدلنا ہے۔ اگر پیشِ نظر مقصد یہ ہوتا تو اس کے لیے یہ کمیشن بُرا نہیں تھا، ہم اس کی تشکیل پر کوئی اعتراض نہ کرتے۔ لیکن یہاں تو جیسا کہ عرض کیا گیا، درحقیقت فقہ حنفی پر نقد و نظر اور اس میں اصلاحات تجویز کرنے کا کام کمیشن کے سپرد کیا گیا تھا۔ ہدایہ، عالمگیری اور سراجی کی غلطیوں کی اس کو اصلاح کرنی تھی۔ بلکہ صحیح معنوں میں پوری فقہ اسلامی کے بہت سے مسلمات اصلاح و ترمیم کے لیے اس کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ یہ کام، ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ ہر کس و ناکس کے کرنے کا نہیں ہے۔ اس کو اگر کر سکتے ہیں تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کتاب و سنت سے براہِ راست گہری واقفیت رکھتے ہوں، جو احکامِ اسلامی کی حکمتوں اور مصلحتوں سے باخبر ہوں، جو اجتہاد اور قیاس کے اصولوں کا علم رکھتے اور ان کا استعمال جانتے ہوں، جو فہمِ شریعت میں اتنا درک رکھتے ہوں کہ کسی اجتہاد یا قیاس کو، بالخصوص جبکہ وہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر ائمہ کا ہو، براہِ راست کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کا سقم واضح کر سکتے ہوں اور ساتھ ہی اپنے اجتہاد کے وزن کو دلائل سے واضح کر سکتے ہوں۔ کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس پورے کمیشن میں ایک شخص بھی ایسا ہے جو ان کاموں کا اہل ہے؟ ان کاموں کا اہل ہونا تو دور کی بات ہے، کیا ان میں سے کسی صاحب نے ہدایہ، عالمگیری اور سراجی کا براہِ راست مطالعہ نہ سہی، ان کتابوں کے وہ انگریزی ترجمے ہی پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے جو ہملٹن، سر ولیم جونز اور بایلی نے کیے ہیں؟ کیا ان میں سے کسی صاحب یا صاحبہ نے قرآن پر، حدیث پر، فقہ اسلامی پر کوئی چھوٹا یا بڑا کام کیا ہے؟ کوئی ریسرچ کی ہے؟ کوئی تصنیف فرمائی ہے؟ کوئی قابلِ ذکر مقالہ لکھا ہے؟ اور کچھ نہیں تو کبھی قرآن ہی کے تیسوں پاروں کی تلاوت

ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں کیا ملتا ہے؟ اگر ان میں سے ہر سوال کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً جواب ان کا نفی ہی میں ہو سکتا ہے تو سوچنے کی بات ہے کہ آج اسلامی شریعت اور اسلامی فقہ سے بھی زیادہ دنیا میں کوئی سائنس مظلوم ہو سکتی ہے جس میں اصلاح و ترمیم کے لیے وہ حضرات قلم اٹھاتے ہیں جو اس کی ابجد تک سے ناآشنا ہیں؟

کمیشن کی حیثیت دستور کی روشنی میں اب اس کمیشن کی حیثیت پر اپنے موجودہ دستور کی روشنی میں غور کیجیے:۔

یہ کمیشن حکومت پاکستان کے ایک اعلان مجریہ ۴ اگست ۱۹۵۵ء کی رو سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہمارے ملک میں بہت اہم تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے ہمارا نیا دستور نافذ العمل ہے۔ اس دستور کے نفاذ کے بعد وہ ساری چیزیں آپ سے آپ کالعدم ہو گئیں جو اس دستور کے منافی ہیں۔ دستور کے مطالعہ کے بعد میرا ناقص نظریہ ہے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کے بعد سے اس کمیشن کی کوئی قانونی اور آئینی حیثیت باقی نہیں رہی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دستور کی دفعہ ۱۹۸ میں جو ضمانت دی گئی ہے کہ کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا اور یہ کہ موجودہ قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق کیا جائے گا اسی کے متعلق ایک خاص شکل بھی متعین کر دی گئی ہے کہ اس دفعہ کے مقصد کو عملی جامہ صرف اس طریقے سے پہنایا جائے گا جو دفعہ مذکور کی ذیلی دفعہ ۳ میں تجویز کیا گیا ہے۔ یہ ذیلی دفعہ ۳ یہ ہے۔

یوم دستور سے ایک سال کے اندر اندر صدر ریاست ایک کمیشن مقرر کرے گا:

(الف) جو سفارشات پیش کرے گا کہ

(۱) موجودہ قوانین کو اسلام کے احکام کے مطابق بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں۔ اور

(۲) ان اقدامات کو عملی شکل دینے کے لیے کیا مدارج ہوں۔ اور

(ب) ان احکام اسلام کو جن کو قانونی شکل دی جا سکتی ہے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی رہنمائی کے لیے موزوں شکل میں مرتب کرے گا۔

کمیشن اپنی آخری رپورٹ اپنے تقرر سے پانچ سال کے اندر اندر پیش کر دے گا۔ کوئی عارضی رپورٹ وہ اس سے پہلے بھی پیش کر سکتا ہے۔ یہ رپورٹ، خواہ عارضی ہو یا آخری، وصولی سے چھ ماہ کے اندر اندر نیشنل اسمبلی کے سامنے پیش کر دی جائیگی اور نیشنل اسمبلی اس پر غور کرنے کے بعد قوانین بنائے گی۔"

اس دفعہ کے آخر میں تشریح کے طور پر یہ بات بھی شامل کر دی گئی ہے کہ کسی مسلم فرقہ کے پرسنل لا پر اس دفعہ کو منطبق کرتے وقت کتاب و سنت کے الفاظ سے ان کی وہی تعبیریں مراد ہونگی جو متعلقہ فرقے کے لوگ پیش کرتے ہوں۔

اب اس دفعہ کے تمام تضمنات سامنے لائیے تو چند باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

(۱) یہ کہ اسلامی احکام کو قانون کی شکل دینے اور موجودہ قوانین کو احکام اسلام کے مطابق کرنے کی اس دستور کے نفاذ کے بعد صرف ایک ہی شکل ہے جو اختیار کی جا سکتی ہے اور وہ وہی ہے جو دفعہ ۱۹۸ کی ذیلی دفعہ ۳ میں بیان کی گئی ہے۔ دستور کے الفاظ (ONLY IN THE MANNER PROVIDED IN CLAUSE 3) اس معاملہ میں نہایت واضح طور پر حصر کرنے والے ہیں۔

(۲) صدر ریاست کے مقرر کیے ہوئے کمیشن کے سوا کوئی دوسرا کمیشن مذکورہ کام کے لیے بالکل آئین کے خلاف ہے۔

(۳) صدر ریاست کے مقرر کیے ہوئے کمیشن کا کام موجودہ قوانین کو احکام اسلام کے مطابق کرنے کے سلسلہ میں تدابیر بتانا، مدارج تجویز کرنا اور مجالس قانون ساز کی رہنمائی کے لیے قانون سازی کے لائق احکام کو موزوں شکل میں ترتیب دے دینا ہے۔

(۴) پرسنل لا کے حد تک ہر مسلم فرقہ سے متعلق کتاب و سنت کی وہی تعبیریں معتبر ہونگی جو اس فرقہ کے لوگ پیش کرتے ہوں، کوئی دوسری تعبیر ان کے سر نہیں منڈھی جائے گی۔

اب اس عائلی کمیشن کی حیثیت پر غور فرمائیے۔

(۱) یہ کمیشن دستور کی دفعہ ۱۹۸ کی ذیلی دفعہ ۳ کے تحت صدر ریاست کا مقرر کردہ نہیں ہے۔ یہ کمیشن دستور کے نفاذ سے پہلے حکومت پاکستان نے مقرر کیا تھا۔

(۲) اِس کمیشن کے حدودِ کار (TERMS OF REFERENCE) اُس کمیشن کے حدودِ کار (TERMS OF REFERENCE) سے مختلف ہیں جو صدرِ ریاست کے مقرر کیے ہوئے کمیشن کے بتائے گئے ہیں

(۳) اس کمیشن نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے پرسنل لا پر پوری بیدردی سے ہاتھ صاف کیا ہے درآنحالیکہ دستور نے نہایت واضح الفاظ میں اس بات کی ضمانت دی ہے کہ ان معاملات میں کتاب و سنت کی وہی تعبیریں معتبر ہونگی جو اس فرقہ کے لوگ پیش کریں گے۔

اس تفصیل سے یہ بات بالکل صاف واضح ہے کہ ہمارے نئے دستور کے بعد اس کمیشن کی کوئی قانونی حیثیت باقی نہیں ہے۔ میں حیران ہوں کہ حکومت نے ایک خلاف آئین کمیشن پر قومی فنڈ کا روپیہ کیوں خرچ کیا؟ اور اگر حکومت اپنی اس غلطی پر متنبہ نہ ہو سکی تھی تو ارکان کمیشن نے آخر ایک بالکل غلط کام پر قوم کا روپیہ کیوں ضائع کرایا؟ کیا کمیشن کے فاضل ارکان اپنے دستور سے بھی اتنی ہی واقفیت رکھتے ہیں جتنی واقفیت قرآن و حدیث سے رکھتے ہیں یا اسلام میں ترمیمات پیش کرنے کا ان حضرات پر اتنا شوق غالب تھا کہ اس واضح حقیقت کی طرف توجہ دینے کی انھوں نے ضرورت ہی نہیں محسوس کی؟

ارکانِ کمیشن کے چند نظریات

اس رپورٹ کے شروع میں ایک تمہید اور اس کے آخر میں ایک خاتمہ ہے جن میں ارکانِ کمیشن نے اپنے کچھ نظریات اور چند اصولِ اجتہاد بیان کیے ہیں۔ یہ نظریات اور یہ اصولِ اجتہاد مختلف اعتبارات سے ہمارے نزدیک بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

اوّل تو کمیشن نے جو سفارشات پیش کی ہیں وہ تمام تر انہی نظریات اور اجتہاد کے انہی اصولوں پر مبنی ہیں اس وجہ سے سفارشات پر غور کرنے سے پہلے ان کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ ثانیاً انہی سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ مذہب پر غور کرنے کے معاملے میں قدیم اور جدید نقطہائے نظر میں کیا فرق ہے؛ ثالثاً انہی سے یہ پتہ چلے گا کہ دراصل معاملہ صرف نکاح و طلاق کے قوانین ہی کی اصلاح کا نہیں ہے بلکہ پورے دین کی اصلاح کا ہے اور یہ صرف اس راہ میں پہلا قدم ہے۔

اس وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ کمیشن کے ان نظریات اور ان اجتہادی اصولوں کا بھی جائزہ لیا جائے۔ میں پہلے چند نظریات کا جائزہ لوں گا

اصل بحث سے پہلے میں اس رپورٹ کی ایک خاص خصوصیت ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ اس میں ارکانِ کمیشن نے اپنے اصلی نظریات صاف صاف الفاظ میں پیش کرنے کے بجائے ان کو اسلام اور قرآن کی تعریف و توصیف کے پردوں میں لپیٹ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے اسلام کی ابدیت و ازلیت پر، اس کے مطابقِ عقل و فطرت ہونے پر، اس کی سادگی و بے ساختگی پر، اس کے قیود و شرائط اور تمام پابندیوں اور تنگیوں سے پاک ہونے پر، اس کے لچکدار اور ہر ماحول کے ساتھ سازگار ہونے پر ایک شاندار تمہید ہوتی ہے اس کے بعد وہ نظریہ یا اصولِ اجتہاد بیان ہوتا ہے جسے ارکانِ کمیشن پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ طریقہ انہوں نے محض پردہ داری کے لیے اختیار کیا ہے تاکہ لوگ پہلے ہی وہلہ میں بھڑک نہ جائیں یا یہ حضرات ذہنی الجھن کے مریض ہیں کہ بیک وقت متضاد قسم کی باتیں کرتے ہیں اور اس تضاد کو محسوس نہیں کرتے۔

مذہب کے متعلق کمیشن کا نظریہ | مذہب ان حضرات کے نزدیک بس چند بنیادی حقائق اور اصولوں پر ایمان رکھنے کا نام ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتے، جو اٹل ہیں، جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں، جو لوحِ محفوظ میں ثبت ہیں، جو محکمات ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

> "مذہب، قرآن کی تعریف کی رُو سے، نام ہے فطرت کے ان ناقابلِ تغیر قوانین اور زندگی کے ان بنیادی اصولوں پر ایمان رکھنے کا جو تبدیل نہیں ہوتے۔ ریاست اور معاشرہ جب تبدیل ہوتے ہیں یا کسی اہم تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو وہ صرف اپنے بالائی ڈھانچے ہی میں تبدیلی کرتے ہیں۔ ان ابدی اور مستحکم اصولوں میں کوئی تصرف نہیں کرتے جو قرآن کے ارشاد کے مطابق تمام مذہب کی اساس ہیں۔ اسلام کا مطالبہ بنی نوع انسان سے ان چند بنیادی اصولوں کو تھامے رکھنے کے لیے ہے جن کو قرآن کی پُرکنایہ زبان میں یوں تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ اس لوحِ محفوظ میں اٹل طور پر ثبت ہیں جو ام الکتاب یا تمام زندگی اور موجودات کا سرچشمہ ہے۔ ان بنیادوں

کو نہ کسی کو تبدیل کرنے کا حق ہے نہ اختیار۔ یہ محکمات ہیں۔ (اس کے بعد ایک حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو اظلم الناس قرار دیا ہے جو ایسے امور سے متعلق سوالات کرے جن میں لوگوں کو رائے اور عمل کی آزادی بخشی گئی ہے اور اس کے سوال کے سبب سے لوگوں پر کوئی پابندی عائد ہو جائے، پھر ارشاد ہوتا ہے) وسیع دائرے میں قانون کی آزادی سے متعلق پیغمبر صلعم کا یہ طرزِ عمل اسلامی اصولِ فقہ کے اس مسلمہ اصول کی بنیاد ہے کہ جو چیز حتمی طور پر ممنوع نہیں ہے وہ اجتماعی اور شخصی فلاح و بہبود کے لیے اختیار کی جائے تو جائز ہے۔ اور ان معاملات میں قانون سازی کی آزادی کا ایک چارٹر ہے جن کے بارے میں کوئی قطعی حکم موجود نہیں ہے"

(گزٹ آف پاکستان ص ۱۲۰۵)

مذہب کا یہ تصور بظاہر بہت معصومانہ نظر آتا ہے لیکن اس کی تہ میں اتریے تو اندازہ ہوگا کہ یہ تصور قرآن کا دیا ہوا نہیں ہے بلکہ باطنیہ کا دیا ہوا ہے۔ جس طرح انہوں نے چند غیر معلوم اور عنقا صفت "حقائق" کو مذہب کی اساس بنا کر ساری زندگی کو شریعت اور قانون کی پابندیوں سے آزاد کر دیا اسی طرح یہ حضرات بھی چند لامعلوم الاسم "ازلی" اور "ابدی" اصولوں کو، جو لوحِ محفوظ میں ثبت ہیں، اب تسلیم مان کر بقیہ ساری زندگی سے مذہب کو خارج کر دینا چاہتے ہیں۔ کوئی ان حضرات سے پوچھے کہ قرآن نے مذہب کی یہ تعریف اپنے کس پارے اور کس سورہ میں کی ہے؟ فطرت کے وہ "ناقابلِ تغیر" اور زندگی کے وہ "بنیادی اصول" کیا ہیں جن کو مان لینے کا نام مذہب ہے؟ ان کا کوئی نام اور خارج میں ان کا کوئی وجود بھی ہے یا محض کمیشن کے ارکان کے ذہنوں ہی میں ان کا وجود ہے؟ میں نے اس پوری رپورٹ کی سطر سطر پڑھی ہے لیکن مجھے اس میں ان ناقابلِ تغیر اور اٹ اصولوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس رپورٹ میں تو خود قرآن کو بھی، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، زمانہ کے ساتھ ساتھ بدل جانے والا اور مٹ جانے والا قرار دیا گیا ہے پھر آخر وہ ابدی اصول کہاں ہیں؟ اگر یہ ازلی اور ابدی اصول صرف لوحِ محفوظ ہی میں ثبت ہیں تو یہ واضح ہونا چاہیے کہ ہماری زندگی کے ساتھ ان اصولوں کا ربط کس چیز کے واسطہ سے قائم ہوتا ہے؟ کیونکہ ہمارے سامنے تو صرف قرآن اور سنت ہی ہیں، لوحِ محفوظ تک رسائی تو صرف ارکان

کمیشن ہی کی ہو گی، ہم ہیچ میرزوں کی رسائی تو وہاں تک نہیں ہے۔

یہ حضرات مذہب کا ایک گول مول اور ننھا منا سا تصور دے کر یہ تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ مذہب کو مولویوں نے خواہ مخواہ کو ایک ہوّا بنا رکھا ہے، وہ تو ایک نہایت مختصر اور سادہ سی چیز ہے۔ بس لوحِ محفوظ میں لکھے ہوئے چند ازلی اور ابدی حقائق ہیں ان کو مان لیجیے اللہ اللہ خیر سلا، بقیہ ہماری ساری زندگی تو خود ہمارے حوالہ کی گئی ہے کہ ہم اس کو جس طرح چاہیں گذاریں اور اس کے لیے جو چاہیں قوانین و احکام ایجاد کریں، مذہب کو اس سے کیا سروکار؟ پیغمبرؐ نے تو ان لوگوں کو سختی سے ڈانٹا تھا جو ان ازلی اور ابدی حقائق کے بتا دینے کے بعد بھی سوالات پوچھ پوچھ کر پابندیوں میں اضافے کرانا چاہتے تھے، پیغمبر تو ہمیں ساری زندگی سے متعلق قانون سازی کا اختیار مطلق سونپ گئے ہیں، لوگ خواہ مخواہ کو بات بات پر مذہب کو بیچ میں لاتے ہیں۔

مذہب بالخصوص اسلام کے متعلق یہ تصور میرے نزدیک کسی مسلمان کا نہیں ہو سکتا۔ یہ تصور جیسا کہ میں نے عرض کیا، یا تو باطنیہ کا ہے یا اباحیت پسندوں کا جو مذہب کا نام لیتے ہوئے اپنی خواہشاتِ نفس کی بندگی کرنا چاہتے ہیں۔ مذہب صرف چند بنیادی اصولوں کے مان لینے ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک پورے نظامِ زندگی کا نام ہے جتنی وسعت زندگی کے اندر ہے اتنی ہی وسعت مذہب کے اندر ہے۔ جتنے پہلو زندگی رکھتی ہے اتنے ہی پہلو مذہب رکھتا ہے۔ زندگی فکر و نظر اور ادراک و تعقل کی نعمت سے بہرہ ور کی گئی ہے اس وجہ سے مذہب عقل کی رہنمائی کے لیے رہنما اصول دیتا ہے، زندگی چونکہ عمل کے لیے بھی ہے اس وجہ سے وہ اعمال کو ٹھیک کرنے کے لیے بھی ایک جامع پروگرام دیتا ہے۔ زندگی کو چونکہ خاندان، سوسائٹی، معاشرہ، سیاست اور حکومت سب سے سابقہ پیش آتا ہے اس وجہ سے وہ ان سارے شعبوں میں بھی وہ چاروں گوشے (FOUR CORNERS) متعین کرتا ہے جن کے اندر رہ کر انسان فلاح حاصل کر سکے۔ پھر زندگی کو چونکہ مرنے کے بعد بھی باقی رہنا ہے اس وجہ سے مذہب آخرت کی کامیابی کے اصول بھی بتاتا ہے۔ الغرض مذہب نے ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا ہے جس کی حد بندی نہ کر دی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان چاروں گوشوں کے اندر ہمیں اس تے قانون بنانے کی آزادی

بھی بخشی ہے لیکن یہ آزادی شترِ بے مہار قسم کی آزادی نہیں ہے کہ ہم چاروں حدیں توڑ کر جدھر چاہیں نکل جائیں۔ بلکہ اس نے یہ ہدایت کی ہے کہ جو معاملات ہمارے سامنے ایسے آئیں جن میں خدا اور رسول کی طرف سے کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو تو وہاں ہمیں خدا اور رسول کے معلوم احکام کے اشارات، ان کے مقتضیٰ اور ان کی روح کو سامنے رکھ کر کوئی ایسی بات متعین کرنی چاہیے جو ہمارے علم و فہم کے حد تک ان معلوم احکام سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتی ہو۔ اسی چیز کو اسلام کی اصطلاح میں اجتہاد سے تعبیر کیا گیا ہے جس پر ہم آگے چل کر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

یہاں زندگی کے ہر شعبے اور گوشے سے متعلق اسلام کے احکام کا حوالہ دینا تو ممکن نہیں ہے لیکن ہم بطورِ مثال ازدواجی زندگی سے متعلق، جو اس کمیشن کے زیرِ بحث ہے، اسلام کے ان چند احکام کا حوالہ دیتے ہیں جو ہماری زندگی کے اس حصہ کی حد بندی کرتے ہیں۔ وہ احکام یہ ہیں:

عورت اور مرد کے درمیان جائز رشتہ صرف نکاح کا رشتہ ہے جو مہر اور احصان کے شرائط کے ساتھ مشروط ہے[1]۔ محرمات سے نکاح ناجائز ہے۔ میاں اور بیوی دونوں پر یکساں حقوق اور یکساں ذمہ داریاں ہیں لیکن خاندان کی شیرازہ بندی کے لیے مرد کو عورت پر قوامیت حاصل ہے۔ نان نفقہ کی ذمہ داری مرد پر ہے۔ نکاح کی گرہ کو کھولنا اور باندھنا صرف مرد کے اختیار میں ہے۔ عورت کسی ناانصافی کی صورت میں خلع کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ مرد نشوز کی صورت میں عورت کو مناسب تادیب کرسکتا ہے۔ مرد کسی اجتماعی یا خاندانی یا شخصی مصلحت کے تحت عدل کی شرط کے ساتھ ایک سے لے کر بیک وقت چار تک نکاح کرسکتا ہے لیکن عورت بیک وقت ایک ہی مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے۔

یہ اور اسی طرح کے چند اصولی احکام خود قرآن نے دیئے ہیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احکام کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔ ان سب کو ملا دینے سے اس خاندانی نظام کا پورا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے جو اسلام میں مطلوب ہے۔ میں ارکانِ کمیشن سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ازدواجی زندگی سے متعلق یہ اصول ان بنیادی اصولوں میں شامل ہیں یا نہیں جو ارکانِ کمیشن کی لوحِ محفوظ

---

[1] ملکِ یمین کا ذکر ہم نے اس لیے نہیں کیا کہ اب یہ چیز خارج از بحث ہے۔

میں ثبت ہیں، جو امت ہیں اور جن کو ماننا ضروری ہے؟

ارکان کمیشن کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے معاملات میں سوالات کرنے سے روکا ہے۔ آپ نے لوگوں کے ہزاروں سوالات کے نہ صرف جوابات نہایت خندہ پیشانی سے دیئے ہیں بلکہ سوال کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی ہے۔ انہی سوالات کے ذریعہ سے قرآن کے بہت سے اجمالات کی وضاحت ہوئی ہے اور بہت سی نئی صورتوں کے لیے شریعت کا حکم معلوم ہوا ہے۔ جن لوگوں نے یہ سوالات کیے انہوں نے پابندیوں میں نہیں اضافہ کیا ہے بلکہ امت کے لیے برکتوں اور رحمتوں کے اضافہ کے موجب ہوئے ہیں۔ آپ نے اگر سوالات سے روکا ہے تو اس طرح کے سوالات سے روکا ہے جس طرح کے سوالات بنی اسرائیل کیا کرتے تھے۔ مثلاً ان کو گائے کی قربانی کا حکم دیا گیا تو انہوں نے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ اس کے سینگ اور اس کی دم کیسی ہو؟ اس کی عمر کتنی ہو؟ اس طرح کے بے فائدہ اور غیر ضروری سوالات کو حضور نے ناپسند فرمایا ہے۔

بہرحال ارکان کمیشن نے دین کا یہ جو تصور پیش کیا ہے کہ وہ صرف چند اصولوں کے مان لینے کا نام ہے وہ اس دین کا تو ہو سکتا ہے جو ان کے اپنے ذہنوں میں ہے لیکن یہ اسلام کا تصور نہیں ہے۔ اسلام تو جیسا کہ عرض کیا گیا ایک پورا نظام زندگی ہے اور اس پورے کو بلا کسی تقسیم و تفریق کے ماننے کا مطالبہ ہے اس کے کسی ایک جزو کا انکار سب کا انکار ہے۔

قرآن حکیم کے متعلق ارکان کمیشن کا تصور اسی طرح اسلام کی ازلیت و ابدیت پر ایک شاندار خطبہ دینے کے بعد قرآن حکیم کے متعلق یہ ارشاد ہوتا ہے:۔

> "اسلام دوسرا نام ہے زندگی کے ان اصولوں کا جو زمانے کے اس مد و جزر سے متاثر نہیں ہوتے جس سے دنیا کی ساری دوسری قوموں کو متاثر ہونا پڑتا ہے۔ یہ اسلام نہیں، بلکہ انسانی تعلقات کی وقتی اور زمانی ضابطہ بندیاں ہیں جو برابر تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ قرآن کے عین زمانۂ نزول میں حالات کی تبدیلی کے سبب سے اس کے بعض احکام تبدیل ہو گئے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی زندگی نے بدلنا اور ترقی کرنا بند کر دیا ہے

اور ان بہت سے قدیم قوانین کو منسوخ کر کے نہیں رکھ دیا ہے جو کبھی انسانی زندگی کی رہنمائی کے لیے نہایت ضروری خیال کیے جاتے تھے۔" (گزٹ آف پاکستان۔ ص ۱۲۳۱)

پہلے اس عمیق کلام کا مطلب سمجھ لیجیے اس کے بعد اس سے نکلنے والے حقائق پر غور کیجیے گا۔

ان حضرات کا فرمانا یہ ہے کہ اسلام کے ابدی اصول تو بے شک تبدیل نہیں ہونگے لیکن اسلام نے انسانی زندگی کے مختلف گوشوں میں جو ضابطہ بندیاں کی ہیں وہ تو برابر تبدیل ہوتی رہی ہیں اور زمانہ اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ برابر تبدیل ہوتی رہیں گی۔ زندگی کے ایک خاص دور میں انسان کے لیے جو لباس تراشا جاتا ہے زندگی کے دوسرے دور میں وہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے دورِ طفولیت میں خاندان کے لیے، سوسائٹی کے لیے، حکومت کے لیے جو ڈھانچے تجویز کیے گئے تھے وہی ڈھانچے ہمیشہ نہیں قائم رکھے جا سکتے۔ اجیر اور مستاجر، زمیندار اور مزارع، محنت اور سرمایہ کے درمیان جو نسبتیں کل تک قائم تھیں اب وہ بدل چکی ہیں اس وجہ سے وہ نظام بھی بدل جانا چاہیے جو پچھلی نسبتوں کو پیشِ نظر رکھ کر بنا تھا۔ ایک خاص طرح کے معاشرتی اور اقتصادی ماحول میں میاں اور بیوی کے درمیان تعلقات کی جو شکل تجویز ہوئی تھی معاشرتی اور اقتصادی ماحول تبدیل ہو جانے سے لازماً وہ شکل بھی بدل جائے گی۔ اگر کل خاندان کا نظم اس نظریہ پر قائم کیا گیا تھا کہ مرد قوّام ہے تو ضروری نہیں کہ یہی نظریہ آج بھی قائم رہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج یہ نظریہ قائم کر لیا جائے کہ عورت قوّام ہے اور پچھلے خاندان کا پچھلا سارا ڈھانچہ توڑ پھوڑ کر از سرِ نو بنایا جائے۔ لیکن یہ محض ڈھانچے کی تبدیلی ہوگی اسلام کے "ابدی اصولوں" کی تبدیلی نہیں ہوگی، وہ تو بدستور محفوظ رہیں گے۔ آخر قرآن کے بہت سے احکام حالات کی تبدیلی کے ساتھ عین اس کے زمانۂ نزول میں بدل جاتے رہے ہیں تو اب اس کے احکام کیوں تبدیل نہیں ہو سکتے؟ قرآن نے ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ڈھانچہ دیا ہے وہ تو محض ڈھانچہ ہے وہ کوئی اسلام کے ابدی اصول تھوڑے سے ہی ہیں! وہ اگر نہ رہے تو نہ رہیں تو اس سے قرآن اور اسلام کا کیا بگڑتا ہے؟ ابدی اصول تو لوحِ محفوظ میں محفوظ ہی ہیں۔

یہ ہے ان حضرات کے مذکورہ بالا ارشاد کا مطلب، اگر اس کو پیچ پیچ الفاظ کے بجائے سادہ

الفاظ میں بیان کیا جائے۔ یہ حضرات بار بار جب اسلام کے "ابدی اصولوں" اور "بنیادی اصولوں" کا ذکر فرماتے ہیں اور یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ یہ ابدی اصول کبھی تبدیل نہیں ہوتے تو آدمی اس خوش گمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کم از کم قرآن تو سراسر ان ابدی اصولوں ہی کا مجموعہ ہے اس وجہ سے اس میں یہ حضرات کسی تبدیلی کی سفارش کی جسارت نہیں فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے سن لیا کہ یہ قرآن بھی ان ابدی اصولوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس نے بھی ہماری انفرادی، ہماری عائلی، ہماری معاشرتی، ہماری معاشی، اور ہماری اجتماعی و سیاسی زندگی کے جو ڈھانچے کھڑے کیے ہیں وہ سب کے سب وقتی اور زمانی ہیں وہ ہمیشہ قائم نہیں رکھے جا سکتے۔ بلکہ یہ تو اتنے بودے اور پھس پھسے ہیں کہ عین زمانۂ نزول قرآن میں جب کہ ابھی ان پر چند برساتیں بھی نہیں گزری تھیں حالات کی تبدیلی کے تحت ان میں تبدیلیاں ہوئیں اور اب تو اس کے قائم کیے ہوئے کتنے ڈھانچے ہیں جو بالکل ہی فرسودہ اور بے مقصد ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسی طرح آئندہ بھی اگر زندگی کو تغیر و ترقی سے نہیں روکا جا سکتا تو قرآنی احکام کو تغیر و تبدل اور اصلاح و ترمیم کی زد سے بھی نہیں بچایا جا سکتا؟

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر ان عنقا صفت اصولوں کا منبع کہاں ہے جن کو یہ حضرات ازلیت و ابدیت کا مقام بلند عطا فرماتے ہیں؟ وہ سارے کے سارے لوحِ محفوظ ہی میں ہیں یا ان کا کوئی حصہ قرآن میں بھی ہے؟ اگر ان کا کوئی حصہ قرآن میں بھی ہے تو ارکانِ کمیشن سے التجا ہے کہ وہ اس حصہ پر نشان لگا دیں تاکہ مسلمان اطمینان کا سانس لیں کہ کم از کم اتنا حصہ —— خواہ وہ کتنا ہی قلیل سہی —— زمانہ کی دستبرد اور ارکان کمیشن کے کلکِ تنسیخ سے محفوظ رہے گا۔ قرآن کا وہ سارا حصہ جو انسانی تعلقات کی ضابطہ بندی کرتا ہے وہ تو ہم نے سمجھ لیا کہ وہ سب کا سب معرضِ خطر میں ہے۔ عبادات میں سے بھی اکثر کا مستقبل تاریک ہی نظر آتا ہے کیونکہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور قربانی سبھی کسی نہ کسی نوعیت سے وقت کے معاشی، سماجی اور اقتصادی نظریات سے متصادم ہیں۔ اخلاق اور آداب کی بھی خیر نظر نہیں آتی۔ سبب کہ یہ تو ہیں ہی سراسر انسانی تعلقات کے تابع۔ بھلا آج عفت، حیا، وفاداری اور صداقت کے وہ معیارات کیا کام دے سکتے ہیں جن کا چلن آج سے سیکڑوں سال

پہلے رہا ہے ؟ رہے عقائد تو ان میں سے ممکن ہے کوئی اتنا سخت جان نکلے کہ اس طوفانِ حوادث کا مقابلہ کر سکے لیکن اس کا تعین بھی جب ہی ہو سکتا ہے جب ارکانِ کمیشن اپنے کیمیاوی تجزیہ کے بعد یہ اطمینان دلا دیں کہ فلاں عقیدے کا انسانی زندگی سے دُور قریب کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے کیونکہ جہاں تک ہمارے ناقص علم کا تعلق ہے ہم تو یہی جانتے ہیں کہ جتنے بھی عقائد ہیں سب ایک طرف انسان کا تعلق خدا کے ساتھ جوڑتے ہیں دوسری طرف انسان کا تعلق انسان کے ساتھ جوڑتے ہیں اس وجہ سے ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی اور انسانی روابط (HUMAN RELATIONS) سے بے تعلق ہو۔ اب تک یہ قائم رہے تو شاید اس وجہ سے قائم رہے کہ اصلی عامل یہ عقائد تھے نہ کہ انسانی تعلقات لیکن اب اگر اصلی عامل کی حیثیت تعلقات انسانی کو حاصل ہو گئی ہے تو لازماً ان کو بھی اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔

بہر حال ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ قرآن کے متعلق اس نظریہ کے بعد اس کی کوئی چیز بھی منسوخ ہونے سے بچ سکے گی۔ لیکن اگر بچ سکے گی تو ارکانِ کمیشن کا اس امت پر بڑا احسان ہو گا اگر تعین کے ساتھ اس کا نام بتا دیں تاکہ ہمیں اطمینان ہو کہ قرآن کے تیس پاروں میں سے کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جو باقی رکھی جائیں گی۔

سنت کے متعلق ارکانِ کمیشن کا نظریہ اس رپورٹ میں سنت کا لفظ اگرچہ بار بار دھرایا گیا ہے لیکن جب ان حضرات کے نزدیک قرآن کی بھی ہر چیز منسوخ ہو سکتی ہے تو پھر غریب حدیث اور سنت کس گنتی میں ہیں ؟ اس لفظ کو رپورٹ میں بار بار دھرانے کی مجبوری غالباً یہ پیش آئی ہے کہ ان کی بدقسمتی سے یہ لفظ دستور میں استعمال ہو گیا ہے۔ جب دستور میں استعمال ہو گیا تو مشہور مثل کے مطابق گلے پڑا ہوا ڈھول بجانا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ جن حضرات نے قرآن کو نہیں بخشا ہے وہ سنت کو کب بخشنے والے ہیں۔ چنانچہ ایک بھرپور وار سنت پر بھی اس رپورٹ کے آخر میں کیا گیا ہے۔ اس کے آخر میں ان حضرات نے حکومتِ پاکستان کو یہ نصیحت کی ہے کہ اگر وہ محض قانونِ اسلامی کی پرانی تعبیرات ہی پر قانع ہو کر رہ گئی تو وہ اس ملک میں کوئی بھی موثر اصلاح نہیں کر سکے گی۔ اگر وہ فی الواقع کوئی

اصلاح کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے اس کو انقلابی قدم اٹھانا پڑے گا۔ اس دلپذیر نصیحت کا اختتام علامہ اقبال مرحوم کے ان الفاظ پر ہوتا ہے:۔

"مستقبل قریب میں جو سوال تمام مسلم ممالک کے سامنے آنے والا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی قانون، ارتقا کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑی ذہنی کاوش کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کا جواب قطعاً اثبات میں ہو سکتا ہے بشرطیکہ عالمِ اسلامی اس سوال کو اس اسپرٹ کے ساتھ حل کرنے کے لیے آمادہ ہو جو حضرت عمرؓ کے اندر تھی (جو اسلام میں پہلے نقاد اور آزاد خیال فرد ہیں، جنہوں نے پیغمبر صلعم کے آخری وقت میں یہ شاندار الفاظ کہنے کی جرأت دکھائی کہ حسبنا کتاب اللہ (ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے)"

میں یہاں علامہ اقبال مرحوم کے ان الفاظ پر خود ان کے الفاظ کی حیثیت سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اس وجہ سے یہ معلوم کرنا کہ اس مبہم ارشاد سے ان کا مدعا کیا تھا، ممکن نہیں رہا لیکن پیش کرنے والوں نے اس کو جس سیاق و سباق میں پیش کیا ہے وہ صاف یہی ہے کہ حدیث و سنت کی معروف پابندیوں کے ساتھ اس ملک میں تجدید و اصلاح کا کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اگر کوئی انقلابی قدم اٹھانا ہے تو یہ حسبنا کتاب اللہ کے انقلابی نعرہ ہی کے ساتھ اٹھایا جا سکتا ہے۔

حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ لگانے والے یہ حضرات قرآن کے متعلق جو تصور رکھتے ہیں اس کا بیان تو تفصیل کے ساتھ اوپر ہو چکا ہے۔ اب حدیث اور سنت سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا اندازہ مذکورۂ بالا اقتباس سے کر لیجیے۔ آخر علامہ اقبال کے اس قول کا حوالہ دینے کا منشا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر خلیفہ راشد اور ڈاکٹر اقبال جیسے شاعر اور فلسفی دونوں کو بیک وقت حدیث اور سنت کے خلاف کھڑا کر دیا جائے۔ ایک عام آدمی جب یہ پڑھے گا کہ علامہ اقبال نے یہ بات لکھی ہے تو ان کی شہرت کے پیش نظر اس کے دل میں اس بات پر اعتماد پیدا ہو گا کہ یہ سرسری اور سطحی نہیں ہو سکتی۔ پھر جب وہ یہ پڑھے گا کہ حضرت عمرؓ نے عین رسول اللہ کی وفات کے وقت یہ

بات کہی کہ ہمیں رسول اللہؐ کی کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں، ہمارے لیے تو کتاب اللہ ہی کافی ہے تو وہ ہی اثر اس کے اوپر پڑنے متوقع ہیں۔ اگر وہ خدا ترس اور محتاط آدمی ہوگا تو حیران و سراسیمہ ہو کر رہ جائے گا کہ یہ کیا بات ہوئی؟ اور اگر بالکل سطحی اور سرسری ذہن کا آدمی ہوگا تو عجب نہیں کہ منکرین حدیث کا ہمنوا بن جائے کہ جب اگلوں میں سے حضرت عمرؓ اور پچھلوں میں سے ڈاکٹر اقبال جیسے لوگ قرآن کے ہوتے حدیث اور سنت کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تو پھر آخر مولوی لوگ اس کو بلاوجہ کیوں اتنی اہمیت دیتے ہیں؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری بیماری میں جس واقعہ کے تعلق سے حضرت عمرؓ کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے وہ ایک اختلافی اور نزاعی واقعہ ہے۔ مولانا شبلی تو سرے سے اس واقعہ ہی کے منکر ہیں۔ اس کے منکر تو بعض اور دوسرے محققین بھی ہیں لیکن میں نے مولانا شبلیؒ کا حوالہ دو وجہوں سے دیا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ حضرت عمرؓ پر جیسی محققانہ کتاب انہوں نے لکھی ہے کسی اور نے نہیں لکھی ہے۔ دوسری یہ کہ ہمارے اس کمیشن نے جن تین چار آدمیوں کو "نقاد" اور "آزاد خیال" مانا ہے ان میں ایک مولانا شبلی بھی ہیں۔ میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس روایت کی بنا پر یہ حضرات، حضرت عمرؓ کو اسلام میں "پہلا نقاد اور آزاد خیال" مانتے ہیں، کمیشن کے ممدوح مولانا شبلی اس روایت کی سرے سے کوئی بنیاد ہی تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن فرض کیجیے کہ حضرت عمرؓ نے یہ بات فرمائی ہے، تو یہ ان کے ساتھ کہاں کا انصاف ہے کہ ان کے اس قول کو وہ معنی پہنائے جائیں جو خوارج یا روافض یا منکرینِ حدیث و سنت نے اس کو پہنائے ہیں۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ حسبنا اللہ، ہمارے لیے اللہ کافی ہے تو اس سے یہ کہاں سے نکل آیا کہ وہ کتاب کی ضرورت کا قائل نہیں ہے یا رسول کی ضرورت تسلیم نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ حسبنا کتاب اللہ تو اس سے حدیث یا دوسرے مآخذ دین کی نفی کیسے ہو گئی؟ جس طرح لفظ اللہ کے اندر کتاب اور رسول سب شامل ہیں اسی طرح کتاب اللہ کے اندر سنت رسول اللہ شامل ہے۔ حضرت عمرؓ کی پوری زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ انھوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کبھی کوئی تفریق نہیں کی۔ سنت تو درحقیقت

کتاب اللہ ہی کی شرح و تفسیر ہے پھر اس کو کتاب اللہ سے الگ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ جس انسان نے بلا اختلاف اس امت کی سب سے زیادہ خدمت کی، جو رسول اللہ کی زندگی میں بھی اور آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے ایک ایک نقشِ قدم کا متلاشی رہا، جس نے اپنے شاندار دورِ حکومت میں ان ساری باتوں کا عملاً مظاہرہ کرا دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے، آخر اس کی خدمت میں ان حضرات کی طرف سے یہ کون سا خراجِ تحسین ہے کہ جب رسول اللہ صلعم کی وفات ہونے لگی تو اس نے سنتِ رسول کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا؟ میرے نزدیک تو فاروقِ اعظم کی نسبت اس طرح کی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کے دل کے اندر ان کے خلاف نہایت گہرا عناد پوشیدہ ہو۔

ان حضرات نے حضرت عمرؓ کو اسلام میں پہلا نقاد اور آزاد خیال جو قرار دیا ہے اس کی وجہ ہمیں تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کی زندگی کے حالات سے یہ لوگ بالکل ہی بے خبر ہیں۔ ان کے متعلق سنی سنائی کوئی بات کانوں میں اگر پڑی ہوئی ہے تو بس یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلعم کے وصال کے وقت "حسبنا کتاب اللہ" کا انقلابی نعرہ بلند کیا تھا، اس کے سوا اور کسی بات کا ان لوگوں کو پتہ نہیں ہے۔ اگر اور باتوں کا بھی پتہ ہوتا تو یہ لوگ ان کو اسلام میں پہلا نقاد اور پہلا آزاد خیال قرار دینے کے بجائے غالباً ان کو پہلا "رجعت پسند" قرار دیتے، کیونکہ جن باتوں کو ان حضرات نے اس رپورٹ میں اسلام کی آزادانہ روح کے منافی قرار دیا ہے یا جن کو بدعت ٹھہرایا ہے یا جن کو فکری جمود کی نشانی بتایا ہے تقریباً یہ ساری ہی باتیں ایسی ہیں جن کے حضرت عمرؓ قائل اور ان پر عامل رہے ہیں۔ بلکہ بعض تو ان کی اولیات میں شمار ہوتی ہیں اور ایسی تو بلا استثناء سب ہی ہیں جو ان کی وسیع سلطنت میں، جو عرب، عراق، ایران، شام اور مصر سب پر پھیلی ہوئی تھی برابر ہوتی رہی ہیں لیکن اصلاحات کے انتہائی دلدادہ ہونے کے باوجود اپنے آٹھ نو سال کے دورِ حکومت میں کبھی ان کو ان چیزوں کی اصلاح کا کوئی خیال نہیں آیا۔ ایک ہی وقت میں دی ہوئی تین طلاقوں کو یہ حضرات بدعت قرار دیتے ہیں اور ان کو انہوں نے کالعدم قرار دینے کی سفارش کی ہے لیکن اگر یہ بدعت ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس "بدعت" کے بانی حضرت عمرؓ ہی ہیں۔ سولہ اور اٹھارہ سال سے کم عمر کی شادیاں کمیشن کی رپورٹ میں جرم قرار دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ اگر یہ جرم ہے

تو اپنی زندگی کے آخری دور میں حضرت ام کلثوم کے ساتھ نکاح کر کے اس جرم کا بھی ارتکاب حضرت عمرؓ کر چکے ہیں۔ بلکہ حضرت ام کلثوم کے والد ماجد حضرت علیؓ بھی، جو تمام امت میں سب سے بڑے فقیہ مانے جاتے ہیں، اس جرم میں شریک ہوئے کیونکہ یہ رشتہ انہی کی اجازت سے ہوا۔ پر ... بہرحال ارکان کمیشن کے نزدیک ایک شدید قسم کا جرم ہی ہوگا، اس جرم میں بھی اولیت کا شرف حضرت عمرؓ ہی کو حاصل ہے، روایات میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات جب پردہ نہیں کرتی تھیں تو حضرت عمرؓ اس تمنا کا اظہار بار بار کرتے رہتے تھے کہ کاش یہ پردہ کریں، چنانچہ انہی کی آرزو کے مطابق حجاب کا حکم نازل ہوا۔ طلاقیں بھی انہوں نے دیں اور ان کی مطلقہ بیویوں میں ایک مسلمہ بھی تھیں لیکن ان کو طلاق دینے کا کوئی "معقول سبب" آج تک کسی کو نہیں معلوم ہو سکا۔ عجب نہیں کہ بیک وقت ان کے نکاح میں ایک سے زیادہ بیویاں بھی رہی ہوں اور اگر خود ان کے نکاح میں نہیں رہی ہیں تو ان کی وسیع سلطنت میں تو بہرحال تعدد ازدواج پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی۔ یہ ساری باتیں اگر جرم ہیں اور محض فقہی تصلب و تشدد کے سبب سے دین میں داخل ہو گئی ہیں تو حضرت عمرؓ اسلام میں پہلے نقاد اور پہلے آزاد خیال کیا ہوئے جبکہ انہوں نے حکومت اور اقتدار رکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ان کی کوئی اصلاح نہیں کی بلکہ الٹے اپنے طرز عمل سے ان کو اور زیادہ اجاگر کر دیا؟ کیا محض اس کارنامے پر ان کو آزاد خیال اور نقاد قرار دیا جا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر وقت میں انہوں نے حسبنا کتاب اللہ کا اعلان کرنے کی جرأت کی؟ اگر یہی وجہ ہے تو اول تو جیسا کہ عرض کیا گیا اس بات کی نسبت ہی ان کی طرف صحیح نہیں ہے اور اگر صحیح ہے تو اس کا مدعا وہ ہرگز نہیں ہو سکتا جو یہ حضرات سمجھے ہیں۔ وہ آزاد اور نقاد تو ضرور تھے لیکن اتنے نقاد نہیں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تنقید کریں اور نہ اتنے آزاد خیال تھے کہ آنحضرت صلعم کے آنکھیں بند کرتے ہی ساری حدیث و سنت کی بساط لپیٹ کر رکھ دیں۔

فقہ اسلامی سے متعلق کمیشن کا نظریہ اب آئیے فقہ اسلامی کے متعلق کمیشن کا نظریہ سنیئے۔ اسلام کی سادگی اور اس کے ہر قسم کے رسمیات اور ہر قسم کے اُصر و اغلال سے پاک و صاف ہونے پر ایک

پر شوکت تمہید کے بعد ارشاد ہوتا ہے:-

"زندگی ایک تخلیقی اور حالات کے ساتھ سازگاری پسند عمل ہے اور یہ لچک قوانین کے مقابل میں بصیرت کی زیادہ طالب ہے۔ اسلام کی ابتدائی سادہ اور آزاد روح کی تجدید ہونی چاہیے اور اس کام میں رہنمائی کے لیے ہمیں اسلام کے آغاز کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جب کہ بعد کے اضافوں سے وہ بالکل پاک تھا۔ بعد کے قوانین اور ضوابط کے مجموعوں کا مطالعہ محض تاریخی اہمیت کے واقعات کی حیثیت سے تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کو اسلام کی مجموعیت کے ساتھ ملایا نہیں جا سکتا۔" (گزٹ آف پاکستان ص ۱۲۳۱)

اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ ارکان کمیشن کے نزدیک فقہ اسلامی کی کوئی دینی اور شرعی اہمیت نہیں ہے۔ اس کی ان کے نزدیک اگر کوئی اہمیت ہے تو وہ محض تاریخی پہلو سے ہے۔ جس طرح آپ طبری، کامل ابن اثیر اور تاریخ الخلفاء وغیرہ کی مدد سے ایک خاص دور کے حالات و واقعات معلوم کر لیتے ہیں، اسی طرح آپ مبسوط، مدونہ، اور کتاب الام سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کسی خاص دور میں ہمارے یہاں کیا کیا قانونی رجحانات رہے ہیں۔ اس سے زیادہ ان فقہی اجتہادات کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

کمیشن نے ایک مقام پر شریعت اور فقہ کی بحث بھی چھیڑی ہے (ملاحظہ ہو ص ۱۲۰۵) اور وہاں یہ فرمایا ہے کہ ہم شریعت میں کوئی تبدیلی نہیں کر رہے ہیں۔ ہم اگر تبدیلی کر رہے ہیں تو فقہ میں تبدیلی کر رہے ہیں جس کی بنیاد تجربات پر ہے۔ جس چیز کی بنیاد تجربات پر ہو وہ صرف علماء ہی کا اجارہ نہیں ہو سکتی، اس میں ہر شخص رائے زنی کر سکتا ہے۔

جہاں تک فقہ اور شریعت کے درمیان فرق کا تعلق ہے اس سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا لیکن یہ بات کہ یہ فرق کس قسم کا ہے اور یہ کہ یہ حضرات جو کچھ تصرفات فرما رہے ہیں وہ صرف فقہ ہی تک محدود ہیں، شریعت ان کے حملوں اور ان کی ترکتازیوں سے محفوظ ہے، دونوں قابل بحث ہیں۔

شریعت اور فقہ میں جو فرق ہے، وہ یہ فرق ہرگز نہیں ہے کہ شریعت میں اشخاص کو کوئی مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے اور فقہ کی بنیاد چونکہ تجربات پر ہے اور اس کی جو کچھ اہمیت ہے محض تاریخ کے

پہلو سے ہے۔ اس وجہ سے اس میں ہر شخص اپنا اقول لگا سکتا ہے۔ شریعت اور فقہ میں جو لوگ یہ فرق بیان فرماتے ہیں وہ یا تو شریعت سے بالکل ناواقف ہیں یا فقہ سے۔ یا دونوں ہی سے بالکل بے خبر ہیں شریعت اور فقہ میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ شریعت ماخذ ہے اور فقہ اس ماخذ سے ماخوذ ہے اور ان دونوں میں وہی نسبت ہے جو ماخذ اور ماخوذ میں ہوتی ہے۔ جس حد تک اس کا اخذ صحیح ہے اس حد تک یہ شریعت کا جزو ہے، اس کو شریعت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر اس کے کسی حصہ کے متعلق تنقید سے یہ ثابت ہو جائے کہ اس کے اخذ کرنے میں کوئی غلطی ہے تو بلاشبہ وہ شریعت کا کوئی جزو نہیں ہے۔

اب یہ ایک بالکل قدرتی امر ہے کہ فقہ کے کسی حصہ کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ اس کا اخذ صحیح ہے یا نہیں ہر ایرے غیرے کا کام نہیں ہو سکتا، یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ماخوذ اور اصل ماخذ دونوں پر محققانہ نظر رکھتے ہوں، عام اس سے کہ وہ علماء میں سے ہوں یا غیر علماء میں سے۔ تجربات کو فقہ میں دخل ضرور ہے لیکن وہ دخل اس نوعیت کا نہیں ہے کہ یہ تجربات ہی فقہ اسلامی کی اساس ہوں۔ جن لوگوں نے یہ گمان کیا ہے وہ فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کے مواد سے بالکل ہی بے خبر ہیں۔ زندگی کے تجربات فقہ اسلامی کی تعمیر میں صرف اس نوعیت سے شریک ہیں کہ ان کی تحریک نے ماہرین شریعت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ زندگی کے ان مسائل کا حل شریعت کے اشارات میں تلاش کریں جن کا حل شریعت کے واضح نصوص میں موجود نہیں ہے۔ نہ اس نوعیت سے کہ انہی تجربات کے اینٹ اور روڑے سے فقہ اسلامی کی عمارت کھڑی کر دی گئی ہو۔ ایک مسجد جب تعمیر ہوتی ہے تو اس کی تعمیر میں موسمی تغیرات کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ لحاظ اسی حد تک رکھا جاتا ہے جس حد تک یہ مسجد کی مسجدیت پر اثر انداز نہ ہو۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اگر موسمی تجربات مسجد کے قبلہ رُخ بنانے کے خلاف ہیں تو قبلہ ہی بدل دیا جائے اور مسجد کی جگہ کوئی مندر یا کلیسا ہی تعمیر کر لیا جائے۔

اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ فقہ کی اصلی اہمیت تو شریعت کے نقطۂ نظر سے ہے لیکن اس کا ایک پہلو تاریخی بھی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کی جو کچھ اہمیت ہے بس تاریخی ہی ہے اور ابن عساکر کی تاریخ بغداد اور سرخسی کی مبسوط میں کوئی فرق ہی نہیں رہا۔ فقہ کا تدریجی ارتقاء ہمیں یہ ضرور بتاتا ہے

کہ کس کس طرح کے محرکات اور عوامل نے ذہنوں کو شریعت پر تدبر کرنے کے لیے اکسایا ہے اور ماہرینِ شریعت نے ہر دور میں اٹھنے والے مسائل کا کس خوبی کے ساتھ حل تلاش کیا ہے۔ یہ بات بالکل مختلف ہے اس بات سے جو ارکانِ کمیشن نے فرمائی ہے کہ فقہی ذخیرہ کی جو کچھ اہمیت ہے بس تاریخ کے نقطۂ نظر سے ہے۔ تاریخ کی کوئی کتاب ہمارے لیے حجت نہیں ہے لیکن فقہ کی ایک کتاب ہر اس شخص کے لیے حجت ہے جو اپنے اجتہاد میں اس کو صحیح سمجھتا ہے اور ایک عامی کے لیے تو دین کے ساتھ وابستہ رہنے کی اس کے سوا کوئی شکل ہی نہیں ہے کہ وہ ان کتابوں پر اعتماد کرے اور زندگی کے مسائل میں ان پر کاربند ہو۔ اگر وہ ان کو محض تاریخ کی حیثیت دے کر اپنے تجربات کی روشنی میں فقہ تیار کرنے کی کوشش کرے گا تو خدا ہی جانتے یہ تجربہ اس کو کس کھڈ میں گرائے۔ آج کے تجربات تو یہ ہیں کہ مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اس کے بغیر قوموں کی ترقی ناممکن ہے۔ زنا بالرضا میں کوئی قباحت نہیں ہے، یہ محض ایک معصومانہ تفریح ہے، شراب، جوا، سود، اور سینما سب زندگی کی ناگزیر ضرورتیں ہیں۔ اب ان چیزوں کو زندگی سے خارج کرنے کی کوشش کرنا سوسائٹی کو رجعت کے غار میں دھکیلنا ہے۔ ان تجربات کے پیچھے پیچھے کون کہہ سکتا ہے کہ کہاں تک جانا پڑے؟

ممکن ہے کسی صاحب کو یہ خوش گمانی ہو کہ یہ سب باتیں تو اس شریعت میں شامل ہیں جس کی نسبت ان حضرات کا یہ اقرار ہے کہ اس میں یہ کوئی تغیر و تبدل نہیں کرنا چاہتے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ کاش ایسا ہی ہوتا اور یہ حضرات متعین طور پر یہ مان لیتے کہ فلاں فلاں چیزیں ان کے نزدیک شریعت میں لیکن میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ یہ اپنی خواہشات کے سوا کسی چیز کو بھی شریعت نہیں مانتے۔ مذہب، قرآن، حدیث اور فقہ کے متعلق ان حضرات کے جو نظریات و تصورات ہیں وہ آپ نے پچھلے صفحات میں معلوم کر لیے ہیں۔ اب ان کے بعد وہ کون سی چیز باقی رہ گئی ہے جس کو یہ شریعت مانیں گے لیکن اگر کسی کو ان کی نسبت اب بھی حسنِ ظن ہے تو آگے کے مباحث یہ اچھی طرح واضح کر دیں گے کہ اپنی خواہشات کے سوا یہ کسی چیز کو بھی شریعت ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ (باقی)

محسنِ انسانیت ؐ

(بسلسلۂ گذشتہ)

نعیم صدیقی

یہود کا شائیلاکی طرزِ عمل یہ تو معلوم عام حقیقت ہے کہ مدینہ کے محدود ذرائع و وسائل پر جب مہاجرین کی روز افزوں آبادی کا بار پڑنے لگا اور بے سرمایہ و بے سہارا لوگ اپنی معاشی زندگی کی تعمیرِ نو میں آکر لگے تو تحریک کے بیشتر کارکنوں پر عالمِ فقر و فاقہ چھا گیا۔ اس امتحانِ فقر و فاقہ میں خود تحریک کا لیڈر اور اس کے گھر کے لوگ سب عام ساتھیوں کے ساتھ برابر کے شریک تھے، بلکہ آزمائش میں سے زیادہ حصہ اسی محسنِ انسانیت کو ملا۔ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی! فقر و فاقہ کی صبر آزمائیوں کو مہاجرین کی بیماری نے دو گنا کر دیا۔ نئی آب و ہوا باہر سے آنے والوں کو راس نہ آئی اور یکے بعد دیگرے سپاہی کے نظام کے سپاہی بیمار ہونے لگے۔ بخار کی ایک وبا پھیل گئی اور یہ بخار بڑا اسٹیلا اور موذی ثابت ہوا۔ ناقص غذا کے ساتھ اس نئی بلا نے جس کو نشانہ بنایا اس کو ہڈیوں کا ڈھانچ بنا کے چھوڑا۔ لوگ معاشی تگ و دو کے قابل نہ رہے۔ ایک طرف تحریک کا سفینہ مشکلات اور مخالفتوں کے نت نئے گردابوں سے دوچار تھا۔ نوخیز اسلامی ریاست ہر پہلو سے محتاجِ تعمیر تھی، اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے طرح طرح کے خطرات تھے۔ افرادِ کار صاحبِ فراش ہو رہے تھے اور پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑے کا پورا پورا انتظام نہ تھا۔ اس مرحلے کو چھوٹی سی انقلابی پارٹی نے جس طاقت کے بل پر پار کیا وہ ایمان باللہ، مقصد کی محبت اور باہمی جذبۂ اخوت کی طاقت تھی۔ دراصل بڑے بڑے تاریخی کارنامے انجام دینے والے افراد اور تنظیموں کی مرکزی طاقت ہوتی ہی ہے ایمان اور اخوت! اسی طاقت نے نحیفوں کو قوی بنائے رکھا اور اسی طاقت نے ذرائع و وسائل کی کمی کے اثرات کو کم سے کم تر کر دیا۔ تاہم ناسازگار حالات کے خلاف جو کچھ جدوجہد ہو رہی تھی اسے اس وبائے عام نے بہت کمزور کر دیا اور اس دوران میں

یہ چرچا بھی ہونے لگا کہ مدینہ کے یہودیوں نے جادو کر دیا ہے اور اب مسلمان پنپ نہیں سکیں گے۔ حالات کیسے سنگین تھے، آئیے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے محسنِ انسانیت کے چند رفقائے کار سے ملیئے۔

یہ دیکھیے، سیدنا حضرت ابوبکرؓ ہیں۔ بستر مرض پر مارے کرب کے تڑپ رہے ہیں۔ اور ایک شعر میں اپنے دلی اضطراب کا اظہار کر رہے ہیں:۔

کل امری مصبح فی اھلہ والموت ادنیٰ من شراک نعلہ

حالت یہ ہے کہ اپنے لیے موت کو جوتی کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب پا رہے ہیں۔

اور ادھر ملاحظہ فرمائیے، یہ سیدنا بلالؓ ہیں۔ کروٹیں لے رہے ہیں لہد رد بھری لے میں الاپ رہے ہیں:۔

الا لیت شعری ھل ابیتن لیلۃ بوادٍ وحولی اذخر وجلیل

وھل اردن یوما میاہ مجنۃٍ وھل یبدون لی شامۃ وطفیل:

یہ مکہ کی وادیوں اور چشموں اور پہاڑیوں کی یاد تازہ کی جا رہی ہے۔ اس وادی میں ایک رات گذار لینے کی حسرت کا اظہار ہے جس میں اذخر اور جلیل نام کی گھاسیں اُگتی ہیں۔ اور ہاں، مجنہ کے چشمے کا پانی پینے اور شامہ اور طفیل نامی پہاڑیوں کا منظر دیکھنے کے ارمان ابلے چلے آ رہے ہیں۔

اور آئیے، ملاحظہ فرمائیے، یہ عامرؓ ہیں۔ لبوں پر کیا ہی بیتاب کن شعر رقصاں ہے:۔

انی وجدت الموت قبل ذوقہ ان الجبان حتفہ من فوقہ

ان کے ابتلائے بدن کا عالم یہ ہے کہ موت کے آنے سے پہلے موت کی آہٹ سن رہے ہیں۔

پھر یہ ہیں حضرت شداد۔ رسول اللہ اپنے اس رفیق کی عیادت کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ مریض بے قرار کہتا ہے کہ اگر بطحان کا پانی پی لیتا تو اچھا ہو جاتا۔ رسول فرماتے ہیں کہ چلے جاؤ، کون روکتا ہے مریض کہتا ہے "ہجرت!"۔ رسول تسلی کے لیے فرماتے ہیں کہ "چلے جاؤ، تم جہاں بھی ہو گے، مہاجر ہی رہو گے"!

صلح حدیبیہ پر جب مسلمان مکہ گئے تو ان کے بدن بار بار کی علالتوں نے ایسے چور چور کر دیئے

ہوئے تھے کہ اہل مکہ کی طرف سے طعنے دیئے گئے کہ او رجاؤ مدینہ! انہی طعنوں کا ردعمل تھا کہ رسول اللہ کے ارشاد کے تحت مسلمان اکڑ اکڑ کر چلتے تھے۔

انہی حالات کی بنا پر حضور فرماتے تھے کہ ان شان الھجرۃ لشدید، یعنی ہجرت کا معاملہ بڑا سنگین ہے، کوئی کھیل نہیں! اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا، ایک بدو نے آکر سرورِ عالم کے ہاتھ پر بیعت کی، لیکن مدینہ میں آتے ہی بخار نے آلیا، اس نے اس کو اسلام کی بدشگونی قرار دیا اور اصرار کر کے بیعت ختم کرائی اور چلا گیا۔ اس واقعہ پر حضورؐ نے فرمایا کہ مدینہ سنار کی بھٹی کی مانند ہے کہ کھوٹ میل کو اگل دیتی ہے اور زرِ خالص کو الگ کر لیتی ہے (بخاری) یعنی تحریکوں کے کارِ عظیم کے لیے جو لوگ اٹھتے ہیں ان کو قدم قدم پر ایسے مراحلِ ابتلا پیش آتے ہیں کہ جن کو پار وہی کرتا ہے جس کے پاس ایمان کا زرِ کامل عیار موجود ہو، کھوٹا مال کسی نہ کسی مرحلے میں الگ ہو جاتا ہے۔ سو مدینہ کا یہ مرحلۂ ابتلا سنار کی بھٹی کا سا کام کر رہا تھا[1]۔

یہی دور تھا جبکہ حضور سرورِ عالم نے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کی کہ "اے اللہ! ہمارے لیے مدینہ کو ویسا ہی دلکش بنا دے جیسے مکہ کو بنایا تھا، یا اس سے بھی زیادہ۔ اور ہمارے لیے اس کے پیمانوں (یعنی غلے اور پیداوار) میں برکت عطا فرما، اور اس پر آئی ہوئی وبا کو مہیعہ (میقاتِ اہلِ شام) کی جانب منتقل کر دے[2]۔

دوسری طرف عالمِ فقر و فاقہ کی کیفیت حد درجہ تشویشناک تھی۔ نئی جگہ آکر معاشی زندگی کی نیو ڈالنا اور پھر اس میں کسبِ حلال کا اہتمام کرنا اور وہ بھی اس عالم میں جبکہ ایک تحریک لمحہ لمحہ انفاقِ مال کے مطالبات لیے سامنے کھڑی ہو، ایسے حالات میں جو ابتلا پیش آسکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ علمبردارانِ حق پر جو کچھ گزری اس کی دردناک روداد سے تاریخ، سیرت اور احادیث کے ذخائر بھرے پڑے ہیں۔ حضرت ابوطلحہ اس دورِ ابتلا کا حال یوں بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ بھوک کی مصیبت میں گھل گھل کر

---

[1] اسوۂ صحابہ از مولانا عبدالسلام ندوی ص ۳۲۰۔

[2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳۹

جب تنگ آگئے تو سہارا حاصل کرنے کے لیے سرورِ عالم کی خدمت میں پہنچے۔ حال بیان کیا اور پیٹ کھول کر دکھلائے کہ کئی روز کے فاقے کی وجہ سے (معدے میں ہونے والی ایک خاص جلن کو روکنے کے لیے) پتھر باندھ رکھے تھے۔ اس پر تاریخ کی اس عظیم ترین شخصیت نے اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ ایک نہیں، دو دو پتھر بندھے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر اپنا دکھڑا بیان کرنے والوں کی تسلی ہو گئی۔[1]

ایک مرتبہ اسی حال میں حضرت ابوبکر بے وقت آئے اور چاہا کہ تسکین حاصل کرنے کے لیے اپنی تکلیف بیان کریں، مگر پھر خیال ہوا کہ اس سے قائدِ اسلام کو خواہ مخواہ مزید پریشانی ہو گی۔ تھوڑی دیر میں حضرت عمر بھی آ پہنچے۔ وہ بھی اسی امتحان کا شکار تھے۔ باعثِ آمد پوچھا گیا تو انہوں نے صاف صاف عرض کیا کہ بھوک کے مارے بیتاب ہوں۔ حضورؐ نے یہ سنا تو فرمایا کہ میرا بھی حال کچھ ایسا ہی ہے۔ طے پایا کہ اپنے رفیقِ مخلص ابوالہیثم کے ہاں چلیں۔ ابوالہیثم باغات کے مالک اور خوش حال تھے۔ تینوں اپنے رفیق کے ہاں پہنچے تو وہ بچارے خادم نہ ہونے کے سبب خود ہی پانی لینے گئے ہوئے تھے۔ آئے تو فرطِ مسرت سے لپٹ گئے۔ پھر باغ میں سے جا کر دسترخوان بچھایا اور کھجوریں توڑ کر حاضر کیں۔ کھجوریں کھا کر ان فاقہ کشانِ راہِ حق نے ٹھنڈا پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کرتے اور ابوالہیثم کے لیے دعائے خیر کرتے واپس ہوئے۔[2]

سعد بن ابی وقاص نے ایک موقع پر بیان کیا کہ تحریکِ محمدیہ کا میں ہی وہ رکن ہوں جس کے ہاتھ سے ایک دشمنِ حق کا پہلا خون گرا، میں ہی ہوں جس نے جہاد میں اولین تیر پھینکا۔ ہم لوگوں نے ایسی حالت میں جہاد کیا ہے کہ ہم درختوں کے پتے اور کیکر کی پھلیاں کھایا کرتے تھے اور اس وجہ سے منہ کے کنارے زخمی ہو جاتے تھے اور اجابت اونٹوں اور بکریوں کی مینگنیوں کی شکل اختیار کر جاتی تھی۔[3]

حضورؐ کے رفیقِ خاص حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ "۔۔۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب میں منبرِ نبوی اور حضرت عائشہ کے حجرہ کے درمیان بھوک اور فاقہ کی شدت کے مارے بیہوش پڑا ہوتا تھا اور لوگ

---

[1] شمائل ترمذی۔ باب ما جاء فی عیش النبی۔ [2] ایضاً

[3] ایضاً۔ یہ منقولہ واقعہ بعد کے دور سے متعلق ہے لیکن اس سے مدینہ میں پیش آمدہ معاشی ابتلاء کا عمومی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ واقعہ سریۂ خبط (جو باختلاف اقوال ۷ھ یا ۸ھ میں ہوا) کا واقعہ ہے۔

مجھ کو جنوں زدہ سمجھ کر (بطور علاج) پاؤں سے میری گردن دباتے تھے، حالانکہ مجھے جنون نہیں ہوتا تھا، وہ محض بھوک کا عالم ہوتا تھا۔[1] حضرت ابوہریرہؓ ہی کا بیان کردہ ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ آپ حضرت عمرؓ کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے اور کسی آیت کا مفہوم زیرِ بحث تھا، باتیں کرتے کرتے اور ساتھ چلتے چلتے یکایک حضرت ابوہریرہؓ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ فاقہ کشی نے نوبت یہاں تک پہنچا دی تھی۔

اس عالم میں حضورؐ اگرچہ بیت المال میں آنے والی دولت کو ساتھ کے ساتھ رفقا کو سنبھالنے کے لیے صرف کرتے جاتے تھے مگر دائرہ صرف اتنا وسیع تھا کہ بیت المال کی آمدنیاں اور انصار اور خوشحال مہاجرین کے فراخدلانہ انفرادی صدقات بدرجۂ ادنیٰ بھی کافی نہ ہوتے تھے۔ عام فاقہ زدہ مہاجرین کے ساتھ ساتھ اصحابِ صفہ کا مستقل دارالاقامہ ضرورت مند تھا، مہمان آتے تھے، بدوی لوگ وقتاً فوقتاً اسلام لانے، زیارت کرنے اور احکام معلوم کرنے آتے، سائل آ آ کر سوال کرتے، اور مسلسل نئے مہاجرین کی آمد رہتی۔ ان حالات میں بیت المال بچارا بھی کیا کر سکتا تھا۔ جب رفقاء اور اہلِ حاجت کی ضروریات کا دباؤ شدید ہوتا تو قائدِ تحریک یا تو اعانت کے لیے اپیل کر دیتے اور لوگ جذبۂ صادق سے اپنا مال نچوڑ دیتے، یا پھر قرض لینا پڑتا۔ قرض اپنی جماعت کے اندر سے کچھ زیادہ مل نہ سکتا تھا، لہٰذا یہودی مالداروں کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ یہودیوں کا حال یہ تھا کہ یہ لوگ پکے مہاجن اور سود خوار تھے اور ان کے سودی جال تمام علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن محمدؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو وہ جس غرض سے قرض دیتے تھے وہ سود سے زیادہ بڑی چیز تھی۔ وہ یہ تھی کہ روپے اور احسان داری کے زور سے ان پر قابو پایا جائے اور اس ذہنیت کے ساتھ وہ قرض خواہی میں بالکل شائیلاک کی ذہنیت کا مظاہرہ کرنے اور توہین و تذلیل پر اتر آتے۔ یہی حال مشرکین کا تھا۔ اس تلخ تجربے سے خود سرورِ عالم کو بھی گزرنا پڑا اور آپ کے ساتھیوں کو بھی۔ بہت سارے واقعات سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ آہ! دنیا کی بھلائی کے لیے زندگیوں کی بازی لگا دینے والوں نے یہ سب کچھ بھی بھگتا، مگر اس معلوک الحالی پر بھی اپنے ایمان اور مقصد کے بارے میں تحریک کے سپاہیوں میں کوئی تزلزل نہیں آیا۔

---

[1] شمائل ترمذی۔ باب ما جاء فی عیش رسول اللہ صلعم۔

محسنِ انسانیتؐ نے اپنے قریبی رفیق اور ذاتی نائب حضرت بلالؓ کو حکم دے رکھا تھا کہ تحریک اور اس کے سپاہیوں کی ضروریات پر وہ آمدنیوں کو بے دریغ صرف کریں۔ حضرت بلالؓ اسی طریق کار پر کاربند رہتے تھے۔ ایک مرتبہ نوے ہزار درہم کی رقم آئی اور ایک بوریئے پر ڈھیر لگا دی گئی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے سرورِ عالمؐ نے اسے ضرورت مندوں میں تقسیم کرا دیا اور ایک حبہ باقی نہ رہا۔ تقسیم ہو چکنے کے بعد ایک سائل آگیا تو اس کے لیے قرض لینے کا حکم دیا۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ کسی موقع پر سیدنا بلال کے سامنے کھجوروں کا ایک ڈھیر لگا پڑا تھا۔ حضورؐ نے دریافت کیا یہ کیسا مال ہے؟ سیدنا بلال نے عرض کیا کہ اسے مستقبل کی نادیدہ ضرورتوں کے لیے روک رکھنے کا ارادہ ہے۔ فرمایا، کیا تم نچنت ہو گئے ہو کہ کل قیامت کے دن کہیں اس مال کو یوں روک رکھنے کے بدلے جہنم کا دھواں تم تک پہنچے۔ خرچ کرو اے بلال! اور تختِ اقتدار کے مالک کی طرف سے کمی کا اندیشہ نہ کرو۔ حضرت بلالؓ ہی کا بیان ہے کہ مدینہ کا ایک مشرک ان کے پاس آیا اور خود پیشکش کی کہ میرے پاس وافر مال موجود ہے، جب ضرورت ہو مجھ سے لے لیا کریں۔ چنانچہ حضرت بلالؓ نے قرض لینا شروع کر دیا۔ یکایک ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت بلالؓ وضو کر کے اذان کہنے کی تیاری میں تھے کہ وہ مہاجن اپنے ساتھ کچھ اور کاروباریوں کو لیے ہوئے آیا اور چلایا کہ "او حبشی!" حضرت بلالؓ اس کے پاس گئے۔ وہ بہت گرم ہوا اور برا بھلا کہنے لگا اور انتباہ دیا کہ مہینہ ختم ہونے کو ہے۔ اگر قرضہ وقت پر ادا نہ کیا تو عرب کے جاہلی طریقے کے مطابق، تم کو غلام بنا لوں گا اور تمہارا وہی حال ہو گا جو پہلے تھا۔ حضرت بلالؓ بیان کرتے ہیں کہ اس فضیحتے سے مجھ پر وہی کچھ گزری جو ایسے عالم میں ہر شریف آدمی پر گزرتی ہے۔ سیدنا بلالؓ عشا کی نماز کے بعد اپنا دکھڑا سنانے محسنِ انسانیتؐ کی خدمت میں پہنچے اور ادائگی کی کوئی تدبیر نہ پا کر روپوش ہو جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ جب قرض ادا کرنے کا کچھ انتظام ہو جائے گا تو میں واپس آجاؤں گا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ حضرت بلالؓ اپنے ارادے کو عمل میں لاتے، اگلی ہی صبح محسنِ انسانیتؐ کی طرف سے بلاوا آیا حاضر ہوئے تو دیکھا کہ حاکمِ فدک کی طرف سے سامان سے لدی ہوئی چار اونٹنیاں ہدیۃً کھڑی ہیں۔ قرض خواہ کو بلا کر حساب بے باق کر دیا گیا اور بقیہ مال حسبِ معمول مستحقین میں تقسیم کر دیا گیا۔

اسلامی تحریک کے ایک سپاہی ابو عبد اسلمی ایک یہودی کے مقروض ہو گئے۔ لیکن ادائیگی کے لیے وہ بجز تن کے کپڑوں کے اور کوئی چیز نہ رکھتے تھے۔ ابو عبد نے یہودی سے مزید مہلت طلب کی لیکن اس کی شائیلاکی فطرت ذرا بھی مہلت دینے پر تیار نہ تھی۔ وہ ابو حدرد کو پکڑ کر آنحضورؐ کے سامنے لے آیا اور اپنا مطالبہ پیش کیا۔ حضورؐ نے ابو حدرد کو ادائیگی کے لیے کہا۔ انہوں نے اپنے حالات سامنے رکھ کر عذر کیا۔ لیکن یہودی قرض خواہ کی غیر انسانی ذہنیت کے پیش نظر آپ نے اصرار کیا کہ جیسے بن پڑے، ادائیگی کرو۔ انہوں نے پھر گذارش کی کہ غزوۂ خیبر سامنے ہے، شاید وہاں سے لوٹ کر آنے پر کوئی صورت حل نکل آئے۔ حضورؐ نے پھر بہ شدت اس بلا سے نجات پانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ یہودی ابو حدرد کا تہ بند لے کر چلا اور اس مرد حق کو اپنا عمامہ اتار کر کمر سے لپیٹنا پڑا۔ ذرا قرضہ کی رقم کی مقدار کا اندازہ کیجیے اور اس پر یہودی قرض خواہ کا اصرار دیکھیے۔ اور پھر اس ظالمانہ وصولی کا تصور کیجیے کہ اپنے مقروض کے تن کا کپڑا اتروا کے دم لیا۔[1]

حضرت جابرؓ بن عبداللہ اسلامی تحریک کی ایک اور بزرگ ترین ہستی ہیں۔ یہ مدینہ کے رہنے والے تھے اور خاصے خوشحال تھے۔ پھر بھی حالات و ضروریات کے تحت ایک یہودی مہاجن سے وقتاً فوقتاً قرض لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ایک سال اتفاق سے کھجوروں پر پوری طرح پھل نہ آیا اور قرضہ مقررہ وقت پر ادا نہ ہو سکا۔ یہودی مہاجن سے بہ مشکل اگلی فصل تک کے لیے مہلت مانگی۔ اگلی مرتبہ پھر فصل خراب ہوئی۔ مزید مہلت دینے سے مہاجن نے انکار کر دیا۔ آخر جابر بھی اپنی رام کہانی سنانے اپنے آقا کی خدمت میں پہنچے۔ حضورؐ چند رفقاء کو ساتھ لے کر یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور اس سے اپیل کی کہ وہ جابر کو مہلت دے دے۔ اس نے انکار کیا۔ حضورؐ تھوڑی دیر کے لیے ادھر اُدھر گھومے اور ایک بار پھر آکر اس سے گفتگو کی۔ لیکن پتھر کو کسی طرف سے جونک نہ لگ سکی۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے آپ سو گئے۔ جاگے تو پھر جا کر وہی ذکر چھیڑا۔ مگر وہ ظالم نہ پسیجا۔ آخر کار آپ جابرؓ کی کھجوروں کے جھنڈ میں جا کر کھڑے ہوئے اور ان سے فرمایا کہ کھجوریں توڑو۔ کھجوریں توڑی گئیں تو توقع سے بہت زیادہ نکلیں۔ قرضہ

---

[1] سیرت النبی۔ شبلی ج ۲ ص ۲۲۲

بھی ادا ہو گیا اور خاصی مقدار بھی بچ رہی۔[1]

حضورؐ کی ایک ذاتی زرہ ایک یہودی قرض خواہ کے پاس رہن تھی۔ آخر دم تک آپ کے پاس اس کو فک کرانے کے لیے اندوختہ نہ ہو سکا۔[2]

ایک مرتبہ سرورِ عالم سے ایک بدوی قرض خواہ مطالبہ کرنے آیا۔ اپنے بدویانہ مزاج کے مطابق اس نے نہایت تندی سے گفتگو کی۔ رفقائے نبوت نے اسے احساس دلایا کہ تم دیکھتے نہیں کس ہستی سے ہم کلام ہو۔ وہ کہنے لگا کہ میں تو اپنا حق طلب کر رہا ہوں۔ حضورؐ اپنے رفقاء کو فرماتے ہیں کہ تم لوگوں کو اس کی حمایت کرنی چاہیے کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔ پھر اس کا حساب بے باق کرنے کا حکم دیا اور اس کے حق سے کچھ زیادہ دلوا دیا۔[3]

زید بن سعنہ کا دلچسپ واقعہ ان حالات پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔ یہ یہودی عالم تھے اور دیانتداری سے محسنِ انسانیت کے دعوائے نبوت کا جائزہ مختلف علامات کی روشنی میں لے رہے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک بدو آیا اور حضورؐ سے آکر ملا۔ اس نے بیان کیا کہ میری قوم مسلمان ہو چکی ہے اور میں نے ان کو دعوت دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم اگر اسلام لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تم کو بھرپور رزق دیگا۔ لیکن بدقسمتی سے اُلٹا قحط پڑ گیا ہے۔ اب اگر ان کو سہارا نہ بہم پہنچایا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کی طرف مستفسرانہ نگاہ سے دیکھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ فی الوقت کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ زید بن سعنہ نے پیشکش کی کہ مجھ سے ۸۰ مثقال سونا لے لیں اور اس کے عوض میں وقتِ معین پر کھجوریں دے دیں۔ معاملہ طے ہو گیا اور حضورؐ نے سونا لے کر بدوی کے حوالے کر دیا۔ زید بن سعنہ کا بیان ہے کہ مقررہ میعاد میں جب دو تین دن باقی رہ گئے تو وہ حضورؐ سے ایسے عالم میں دوچار ہوئے کہ آپؐ اپنے چند رفقا سمیت کسی کے جنازے کی نماز سے فارغ ہو کر ایک دیوار کے پاس تشریف فرما تھے۔ زید نے حضورؐ کے کرتے اور چادر کے پلوؤں کو کھینچتے ہوئے نہایت ترش روئی سے کہا کہ "اے محمدؐ! میرا قرضہ ادا نہیں کرتے! خدا کی قسم میں تم سب اولادِ عبد المطلب کو خوب جانتا ہوں کہ پکے نادہند ہو۔" حضرت عمرؓ نے زید کو گرم نگاہ ہوں

[1] سیرت النبی شبلی - ج ۲ ص ۱۳۷۔ [2] شمائل ترمذی - باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ صلعم۔ [3] سیرت النبی شبلی - ج ۲ ص ۲۳۹

سے گھورا اور کہا کہ او خدا کے دشمن! کیا کہتا ہے! خدا کی قسم اگر مجھے (حضور سے) اندیشہ نہ ہوتا تو تیری گردن اڑا دیتا" محسنِ انسانیتؐ نے حضرت عمرؓ کو سمجھایا کہ ایسے موقع پر آپ کو یہ چاہیے کہ ایک طرف مجھے حسن و خوبی سے ادائے حق کرنے کی تلقین کرتے، دوسری طرف اس شخص کو مطالبہ کرنے کے بہتر طریقہ کی نصیحت کرتے۔ پھر فرمایا کہ اب جاؤ اور جا کر اس کا حساب ادا کر دو اور ڈانٹنے کے بدلے میں بیس صاع (مدینہ کا ایک معروف پیمانہ) کھجوریں مزید دو۔

یہ دراصل زید بن سعنہ کی طرف سے صاحبِ نبوت کا آخری امتحان تھا۔ حضرت عمرؓ سے اپنا تعارف کرایا اور ان کو گواہ بنا کر اسلام قبول کیا اور اپنا آدھا مال ملتِ اسلامیہ پر صدقہ کر دیا۔ یہ زید یہودی مہاجنوں کی صف سے بالکل الگ اپنا مقام بلند رکھتے ہیں، لیکن ان کے واقعہ سے بھی یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ مدینہ میں تحریک اور اس کے افراد کی مالی مشکلات کس درجے کی تھیں اور ان کے زیرِ اثر آئے دن قرض اٹھانا پڑتا تھا اور قرض خواہوں کی طرف سے سختیاں برداشت کرنی پڑی تھیں۔

یہود اور مالدار مشرکین نے ایک طرف تو یہ مہاجنی محاذ تحریکِ اسلامی کے خلاف کھول رکھا تھا، دوسری طرف وہ ایک اور مہم میں بھی مصروف تھے۔ وہ یہ تھی کہ لوگوں کو "انفاق فی سبیل اللہ" سے روکا جائے تاکہ تحریک مالی کمزوری کی وجہ سے سوکھ سوکھ کر ختم ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک تو وہ ترغیبِ انفاق کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے کہ لو جی، مسلمانوں کا خدا بھی دیوالیہ ہو کر قرض مانگنے نکل کھڑا ہوا ہے۔ کبھی کہتے کہ اسلامی تحریک کے خدا کا ہاتھ بند ہے۔ یہ باتیں یہودیوں سے چل کر منافقین کی زبانوں پر چڑھ جاتیں اور پوری فضا کو غبار آلود کر دیتیں۔ دوسری طرف وہ انفاق کرنے والوں سے مل مل کر کہتے کہ دیکھو، کیوں اپنا مال غارت کر رہے ہو، مکہ کے چند کنگالوں کو کھلا پلا کر تم کیا حاصل کر لو گے۔ اپنے بال بچوں کی خدمت کرو، کاروبار چلاؤ۔ آخر مال کا یہ کیا احمقانہ مصرف تم نے ڈھونڈا ہے۔ اس مہم کو چلانے والے یہود اور منافقین ہی کے بارے میں قرآن نے کہا کہ "یامرون الناس بالبخل" یعنی یہ لوگوں کو کنجوسی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان معلمینِ بخل میں کردم بن قیس (کعب بن اشرف

کا حلیف)، اسامہ بن حبیب۔ نافع بن ابی نافع، بحری بن عمرو، حُیَیّ بن اخطب اور رفاعہ بن زید بن تابوت نامور اور سر برآوردہ حضرات تھے۔ یہ انصار کے پاس آکر بیٹھتے اور ان سے ناصحانہ انداز میں کہا کرتے "اپنے مال یُوں نہ اُڑاؤ، یہ یوں جائیگا تو ہمیں تمہارے مفلوک الحال ہو جانے کا اندیشہ ہے، سو تم تحریک اسلامی پر خرچ کرنے میں اتنی تیزی نہ دکھاؤ، تمہیں کچھ سدھ بدھ نہیں کہ حالات کیا ہو جائیں گے"[1]

یہود کے پانچویں کالم کے کارندوں میں یہ سرگوشیاں ہوتی تھیں کہ "رسول اللہ کے ساتھیوں پر مال خرچ کرنے سے باز آجاؤ تاآنکہ یہ سب چھٹ چھٹا جائیں" (قرآن ۔ سورہ منافقون ۔ آیت ۷)

کتنی دُور اندیشانہ اسکیم تھی۔ یعنی ایک طرف سے جذبۂ انفاق کے سرچشمے کو بند کر دیا جائے اور دوسری طرف مہاجن بن کر اپنے شائیلاکی پنجے کی گرفت تحریکِ اسلامی کی گردن پر کسی جائے۔ اسکیم کامیاب ہو جاتی تو ایمان واستدلال اور عمل و کردار کے میدان میں مقابلہ کیے بغیر سر پہ منڈلاتے ہوئے انقلاب کو شکست دی جاسکتی تھی۔ مگر معاملہ ایک خدائے دانا و بینا اور ایک حاکمِ قادر و توانا سے تھا۔ اس کی گہری چالوں نے دشمنانِ حق کی چالوں کو شکست دے دی۔

اس داستان میں دیکھنے کی چیز محسنِ انسانیت اور تحریکِ حق کے پروردہ سپاہیوں کا وہ صابرانہ کردار ہے جو مخالفین کی ظالمانہ اور گھٹیا حرکات کے جواب میں نمودار ہُوا۔ انسانیت کا وہ کیسا اعلیٰ نمونہ تھا جس نے اخلاقی علو کا دامن سخت مایوس کن اور اذیت دینے والے حالات میں بھی نہ چھوڑا۔

یہود کا پیدا کردہ "پانچواں کالم" تاریخ انسانی کے صدہا تجربات اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ اخلاص کی رُوح اپنے اندر لیے جب کبھی کوئی دعوتِ خیر و فلاح فاتحانہ اقدام کرتی ہے تو اس کے مقابلے پر آنے والی ردِ عملی طاقتوں میں سے ایک وہ ہوتی ہے جو رُو در رُو ہو کر اس سے ٹکر لیتی ہے اور قوت کی تلوار بے نیام کر کے آخر دم تک مقابلہ کرتی ہے۔ مگر ایسے فاسد عناصر جو اخلاقی پستی کی وجہ سے بزدلی اور کمینگی کی سطح پر گر چکے ہوتے ہیں وہ نفاق کی کمین گاہ میں بیٹھ کر ریشہ دوانیاں کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ مشرکین مکہ کی ردِ عملی حرکت پہلی نوعیت کی تھی، مگر مدینہ کے یہود اور ان کے ہم نواؤں نے دوسری پوزیشن اختیار کی۔

[1] سیرت ابن ہشام۔ ج ۲ ص ۲۰۵

تحریک اسلامی اب چونکہ ایک ریاست کی صورت اختیار کر گئی تھی اور یہ ریاست سب کی آنکھوں کے سامنے نشو و نما پا رہی تھی اور ہر چہار جانب سے بیدار دل اور متحرک اور عمل پسند افراد کو چن چن کر اپنے ساتھ لے رہی تھی، لہٰذا مخالف طاقت حسد اور احساس کہتری کے خوفناک ردّعمل کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ مگر دلوں ہی دلوں میں جو ابال تھا اس کے لیے بہاؤ کا کوئی راستہ نہ تھا اور حالات پر اثر اندازی کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ نظریۂ اسلامی کے مقابلے میں یہود کے پاس کوئی معقول، سیدھا سادہ، عوام کو اپیل کرنے والا اور حرکت پیدا کرنے والا تعمیری نظریہ نہ تھا۔ ان کے پاس کچھ بے جان اور کھوکھلے عقیدے تھے جو الٹا تاریخ کے بہاؤ کو روکنے والے اور انسانی فطرت میں جمود پیدا کر دینے والے تھے۔ ان کے پاس تحریک اسلامی کے پیدا کردہ اخلاقی کردار کے جواب میں برابر کی ٹکر کا اخلاقی کردار نہ تھا، بلکہ وہ کردار کے لحاظ سے انسانیت کے کم سے کم مطلوبہ معیار سے بھی گرے ہوئے تھے اور کوئی محرک باقی نہ تھا جو ان کو اس پستی سے اٹھا سکے۔ انسانیت کی تعمیر نو کی قرآنی دعوت جو نیا انسان بنا کے لائی تھی، یہودیت کا فرسودہ نمونۂ انسانیت اس کے سامنے کھڑا ہونے کے قابل نہ تھا۔ پروپیگنڈے کے میدان میں غلط فہمیوں اور شرارتوں کا کتنا ہی گرد و غبار وہ اڑاتے پھریں، لیکن استدلال کے میدان میں وہ زک پر زک اٹھا رہے تھے۔ پھر وہ اپنے آپ کو چاہے کچھ سمجھتے رہیں، تاریخ کی طاقت مسلم تحریک کے ساتھ تھی اور واقعاتی پیکارگاہ میں یہود پر ہر آن کاری ضربیں پڑ رہی تھیں۔ زمانہ ان کو پیچھے چھوڑ کر اسلامی نظریۂ حیات کا جھنڈا لہراتا آگے ہی آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ سیاسی لحاظ سے وہ چاہتے تھے کہ اسلامی انقلاب کی شہ رگ کاٹ ڈالیں، لیکن حلیفانہ معاہدات نے ان کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ اس واقعاتی نقشے میں گھر کر وہ اپنے آپ کو بے چارگی و بے بسی کے مقام پر پاتے۔ بے چارگی و بے بسی کے اس احساس نے ان کی سیرت کی بنیادی کمزوریوں کے ساتھ مل کر بزدلی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ بے بسی اور بزدلی کے عالم میں آدمی کے اندر کام کرنے والے حریفانہ جذبات ہمیشہ حسد اور کینہ کی راہ سے اسے نفاق کی کمین گاہ تک لے جاتے ہیں۔ وہ مخالف پر سامنے سے وار کرنے کے بجائے پیچھے سے شبخون مارتا ہے۔ وہ کھلم کھلا تاخت و تاراج کے بجائے نقب زنی کی اسکیمیں بناتا ہے۔ یہود نے بھی اسی بزدلانہ موقف کا سنبھال لیا۔

"منافقین" کے ذلیل عنصر کے ظہور کے لیے واقعاتی صورتِ حال نے دو اسباب پیدا کر دیئے تھے۔ ایک تو یہی یہود اور ان کے ہم نواؤں کا حاسدانہ انتقامی جذبہ برسرِ عمل تھا اور اس جذبے میں چونکہ براہِ راست حملہ کرنے کی طاقت نہیں تھی، اس وجہ سے نفاق کا خفیہ محاذ برسرِ عمل آ گیا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر بہت سے لوگ اپنا مستقبل بنانے کے لیے اسی چور دروازے سے اندر داخل ہونے لگے۔

اس چور دروازہ کا افتتاح بہرحال یہودی ذہن نے کیا۔ ان کے اچھے اچھے سردار تھے جو اسلامی جماعت کی صفوں میں اپنے حریفانہ جذبات کو اسلام کے بہروپ میں چھپائے ہوئے داخل ہونے لگے۔ بنی قینقاع میں سے نمایاں مرتبے کے حسب ذیل بزرگ "پانچویں کالم" کے طور پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

(۱) سعد ابن حنیف (۲) زید ابن لصیت (۳) نعمان ابن اوفیٰ ابن عمرو (۴) رافع بن حُریملہ (۵) رفاعہ بن زید بن تابوت (۶) سلسلہ ابن برہام (۷) کنانہ ابن صُوریا۔

ان میں سے زید بن لُصیت وہ شخص ہے جو بنی قینقاع کے بازار میں حضرت عمرؓ سے نبرد آزما ہو گیا تھا۔ پھر یہی تھا جس نے رسول اللہ صلعم کی اونٹنی کے کھو جانے پر طعنہ دیا تھا کہ "یوں تو آسمانوں کی خبریں دیتے پھرتے ہیں لیکن اتنا پتا نہیں کہ اونٹنی اس وقت کہاں ہے۔" اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ "بخدا میرا حال یہ ہے کہ میں بجز اس کے کچھ نہیں جانتا جو کچھ کہ اللہ تعالیٰ مجھے بتا دے۔ اور اب اللہ تعالیٰ نے مجھے اونٹنی کے بارے میں اطلاع دے دی ہے، سو وہ اس وادی میں ہے اور ایک درخت کے ساتھ اس کی باگ اُلجھ گئی ہے۔" چنانچہ رفقاء تلاش کو گئے تو بالکل یہی صورتِ واقعہ آنکھوں سے دیکھی۔

ان میں سے رافع بن حُریملہ کا مقامِ نفاق اتنا بلند تھا کہ جس دن وہ مرا تو سرورِ عالم نے خود فرمایا کہ "آج منافقین کے سرخیلوں میں سے ایک سرخیل مر گیا ہے۔" ایسا ہی مقام رفاعہ بن زید بن تابوت کا تھا۔ چنانچہ غزوہ بنی عبدالمصطلق سے واپسی پر طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور لوگ کچھ گھبرا گئے تو حضورؐ نے تسلی دلاتے ہوئے فرمایا کہ یہ طوفان منافقین کے ایک سرخیل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے متحرک ہوا ہے۔ لوگ مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ رفاعہ کی روح اسی طوفان کی لہروں کے ساتھ پرواز کر چکی ہے[۱]۔

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۴-۱۷۵

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ منافقین کی صفوں میں جتنے بھی لوگ شریک ہوئے، سب کے سب پختہ سال اور خوش حال لوگ تھے۔ ان کے سامنے مفاد تھے اور ان کے مزاج بالعموم غلط خیالات و جذبات کے سانچے میں ڈھل کر پتھر کی طرح سخت ہو چکے تھے۔ نوجوان طاقت تحریک اسلامی کے ساتھ تھی۔ بروئے تحقیق صرف ایک نوجوان پانچویں کالم میں ملتا ہے جس کا نام قیس ابن عمرو ابن سہل تھا۔

یہ گروپ اتنا ہی معدودہ نہ تھا، بلکہ درحقیقت یہ چند حضرات تو پانچویں کالم کے قائد اور سالار تھے۔ یہ اپنے حلقوں سے منافقین بھرتی بھی کرتے، اسلامی جماعت کے اندر سے کمزور افراد کو تلاش کر کر کے ان کو متاثر بھی کرتے اور ان کو استعمال میں لاتے۔ تشکوک و شبہات پھیلا کر اور مسلمانوں کی مجلسوں میں سنجیدہ معاملات میں استہزاء و تضحیک کے پہلو پیدا کر کے فضا کو خراب کرنے کے درپے رہتے۔ مسجد میں جا کر تمام اہم گفتگوئیں سنتے اور پھر آ کر اپنی مجالس میں رپورٹ کرتے۔ راتوں کو سازشی مجالس میں بیٹھ کر شرارت کے نت نئے منصوبے بناتے اور نئے نئے طریقوں سے ان کو روبعمل لاتے۔ یوں تو اپنے انداز و اطوار کی وجہ سے نفاق کا پیدا کردہ یہ بے ڈھنگا کردار نبی اکرمؐ اور مسلمانوں کی نگاہ میں پہچانا جاتا تھا اور ساتھ کے ساتھ ہر مرحلے پر وحی الٰہی کی روشنی ان کے خیالات، ان کی حرکات اور انکی کارروائیوں اور سازشوں بلکہ ان کے مجرمانہ ضمیر کی خاص خاص علامات کو نمایاں کرتی رہتی تھی۔ لیکن ایک موقع پر مسجدِ نبوی میں ان اکابرینِ نفاق کی حرکات حدِ برداشت سے باہر ہو گئیں۔ مجمع عام میں یہ ٹولی کی ٹولی بالکل الگ دھڑا بنی بیٹھی تھی اور اپنی جگہ الگ کھسر پھسر کر رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر سرورِ عالمؐ نے ان کو مسجد سے نکل جانے کا حکم دیا۔ بعض بزرگ تو ایسے ہٹیلے تھے کہ ان کو "پابدستِ دگرے دست بدستِ دگرے" کی شان سے نکالا گیا۔

لیکن ان سرخیلانِ نفاق کی خود اپنی مرکزی قیادت عبداللہ بن ابی کی ذاتِ گرامی میں مرتکز تھی۔ یہ شخص جو واقعۂ افک میں فتنہ کی بارود کو فتیلہ دکھانے والا ہیرو تھا، اس کی رگ رگ میں اسلامی انقلاب کے خلاف بغض و کینہ کا آتشیں لاوا بھرا پڑا تھا۔ اس لاعلاج بغض و کینہ کی بنیاد کیا تھی، یہ اسید بن حضیر کی زبانی سنیئے جنھوں نے غزوۂ بنی عبدالمصطلق کے موقع پر عبداللہ بن ابی کی ایک شرانگیزی پر تبصرہ کرتے

ہوئے خائدِ انسانیت کی خدمت میں عرض کیا کہ :

"یا رسول اللہ! اس شخص (کے دُکھی جذبات) کی رعایت فرمایئے ۔ مدینہ میں جب آپ کا ورود ہُوا تھا تو اس موقع پر ہم اِس کو بادشاہت کی مسند پر بٹھانے کی پوری تیاریاں کر چکے تھے اور اس کے لیے تاج تیار ہو رہا تھا۔ آپ کی آمد سے اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ بچارا اسی کی جلن نکال رہا ہے ۔" (تفہیم القرآن۔ سورۂ نور کا دیباچہ[۱])

جن لوگوں کے سپنے بنائے کھیل کسی دعوت یا تحریک کے ہاتھوں بگڑ جاتے ہیں اور جن کے مفاد کی کمند ایسے عالم میں ٹوٹتی ہے کہ سامنے دو چار ہی ہاتھ پر لب بام ہوتا ہے ۔ وہ پھر اپنے سینے میں بس بھر ساری عمر پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں۔ ایسے شکست خوردہ حریف کبھی معاف نہیں کیا کرتے ! اسلام کے بارے میں یہی کیفیت تھی جس میں عبداللہ بن ابی اوّل روز سے مبتلا ہو گیا تھا اور مرتے دم تک اسی میں مبتلا رہا۔ اوّل اوّل اسلام لے آیا تاکہ اس نئی طاقت کے نظام کے اندر اپنی جگہ بنا سکے اور پھر اس کے اندر سے قدم بہ قدم اوپر اٹھ کر قیادت و اقتدار کی چوٹی تک پہنچ سکے ۔ لیکن اس نظام کے اندر سے تو جو بھی کوئی راستہ جاتا تھا وہ ایمان اور عمل کے بل پر طے ہو سکتا تھا ۔ سو عبداللہ بن ابی کے لیے نفاق کے سوا کوئی دوسرا مقام نہ تھا۔ ابتداءً یہ نفاق مخفی رہا۔ لیکن ایک دن اچانک اس کے دل کا ناسور پھٹ پڑا اور گندہ متعفن مادہ بہنے لگا۔

ہُوا یہ کہ حضورِ پاک سعد بن عبادہ کی بیمار پرسی کے لیے تشریف لے گئے ۔ حضورؐ گدھے پر سوار تھے اور اپنے پیچھے آپ نے اُسامہ بن زید بن حارثہ کو بٹھا لیا۔ یہی اُسامہ بتاتے ہیں کہ راستہ میں ایک جگہ عبداللہ بن ابی مجلس جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے گرد قبیلے کے لوگ حلقہ زن تھے ۔ سرورِ عالمؐ کا گذر ہُوا تو اُسے بُرا لگا اور مُنہ پھیر لیا۔ حضورؐ قریب پہنچے تو سلام کہا، پھر ذرا دیر کے لیے رُکے اور قرآن کا کچھ حصہ پڑھا اور خدا کی طرف دعوت دی - خدا کی یاد دلائی اور اس کے غضب سے ڈر دلایا۔ اُسامہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن اُبی دم سادھے بیٹھا رہا اور کوئی بات نہیں کی۔ لیکن جب حضورؐ بات سے فارغ ہو کر

---

[۱] ماہنامہ ترجمان القرآن جلد ۵ ۴ عدد ۲ -

چیخنے لگے تو بڑے گستاخانہ اور بازاری سے انداز میں منہ پھاڑ کے کہا کہ "اے فلاں!" ـــ "بات کرنے کا تیرا یہ ڈھنگ ٹھیک نہیں" ـــ "اپنے گھر میں بیٹھ اور جو کوئی تیرے پاس جائے تو بس اس کو اپنی بات سنا دیا کر" ـــ "اور جو کوئی تیرے پاس نہ جائے اسے تنگ نہ کیا کر اور اس کے گھر میں آ کر ایسی دعوت نہ سنا کہ جو اسے ناگوار ہو" دیکھیے ان الفاظ کو، پرکھیے اس انداز بیان کو! لفظ لفظ زہر میں بجھا ہوا ہے اور حرف حرف سے شرارہ اٹھ رہی ہے۔ کیسے دل چھیدنے والے بول ہیں، کیسے اشتعال دلانے والے جذبات ہیں۔

درحقیقت یہ عبداللہ بن ابی نہیں بول رہا تھا، یہ جاہلیت کا مٹتا ہوا دور تھا جو آنے والے دور امن و عافیت کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

اور حضورؐ نے اپنے مقام کی بلندیوں سے پستی کی اس بڑبڑاہٹ کو سنا ـــ اس کریم النفس ہستی کو غصہ کی بجائے اغلباً رحم ہی آیا ہوگا۔

مجلس میں عبداللہ بن رواحہ بھی موجود تھے جو مسلم پارٹی کے رکن تھے۔ ان کی غیرت نے اپنا فرض ادا کیا اور انہوں نے منافق اعظم کو ٹک کر جواب دیا کہ حضورؐ کیوں نہ آئیں، ہم آپؐ کو چاہتے ہیں۔ آپ ہمارے گھروں اور ہماری مجلسوں میں آئیں گے، ہم آپؐ سے محبت کرتے ہیں اور آپؐ ہی کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سربلندی عطا فرمائی ہے اور آپ ہی کے ذریعے سے ہدایت عطا کی ہے۔

اس تجربے سے گزرنے کے بعد قائد انسانیت سعد بن عبادہ کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے چہرہ کا ایک خاص رنگ دیکھ کر استفسار کیا۔ آپؐ نے واقعہ بیان کیا۔ سعد نے بھی وہی واقعاتی پس منظر بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو مدینہ لے آیا، ورنہ ہم اس کے لیے تاج تیار کرا رہے تھے۔ آپؐ نے تو آ کر اس کی بادشاہت کا خواب درہم برہم کر دیا ہے۔ مدعا یہ تھا کہ اس کا یہ ردعمل قدرتی ہے اسے کچھ اہمیت نہ دینی چاہیے۔

یہ شخص نفاق کے پورے ڈرامے کا مرکزی ہیرو بن کر تاریخ کے اسٹیج پر کام کرتا رہا: سب سے آگے یہ تھا، اس کے نیچے پیچھے موٹے موٹے یہودی بزرگ تھے، ان کے پیچھے شعوری طور پر نفاق کا کھیل

کھیلنے والے عوام تھے۔ ان کے پیچھے ادھ کچرے اور تھڑ دلے مسلمان تھے اور سب سے آخر میں جاہل اور ناسمجھ بدوی تھے۔ تحریک اسلامی کے خلاف جو بھی تو عملی حرکت نمودار ہوتی تھی اس میں درجہ بدرجہ ان مختلف عناصر کا حصہ ہوتا تھا۔

مدینہ میں مسلم جماعت جن جن مخالفتوں اور مزاحمتوں سے دوچار ہوئی اور سرورِ عالم کو جن جن شرانگیز طوفانی ریلوں کا سامنا کرنا پڑا ان سب میں یہود کے زیرِ اثر نفاق کی اس فاسد طاقت کا بڑا بھاری پارٹ شامل رہا ہے۔ لہٰذا اگرچہ سارے محاذِ مخالفت پر یہود کی رہی، لیکن جتنے بھی منفی فتنے محسنِ انسانیت کا راستہ روکنے کے لیے اٹھے ان میں عملاً بہت بڑا حصہ مرلیفیانِ نفاق کا تھا جو یہود کے آلۂ کار بن کر کام کرتے رہے۔

(بقیہ تزکیۂ نفس)

کہ اس وقت تم کیا کرو گے جب تمہیں ایسے لوگوں کے اندر زندگی گذارنی پڑے گی جو بالکل بھوک کی مانند ہونگے، نہ ان کے اندر عہد کا کوئی احساس ہوگا نہ امانت کا اور ان کے اندر جھگڑے اور اختلافات برپا ہو جائیں گے جس کے سبب سے وہ اس طرح (ہاتھ کے اشارہ سے آپؐ نے سمجھایا) ہو جائیں گے؟ عبداللہ بن عمروؓ نے پوچھا ایسے حالات کے لیے آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو جو معروف ہے اس پر عمل کرو اور جو منکر ہے اس سے بچو، اپنی ذات کی فکر کرو اور عوام کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔" (ترمذی)

اس مضمون کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں یہی بات اجمال اور تفصیل کے مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ آدمی کو عوام کی اصلاح سے بے تعلق ہونے کی اجازت صرف اس صورت میں ہے جب وہ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائے کہ اب لوگوں کے اندر کوئی اچھی بات سننے اور قبول کرنے کی سرے سے کوئی صلاحیت باقی ہی نہیں رہ گئی ہے اور ان کو پانے کی کوشش میں اندیشہ ہے کہ کہیں وہ خود اپنے آپ کو نہ کھو بیٹھے۔ اوپر والی حدیث میں حُثالہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو بھوک، چھلکے، بھوسی اور ایسی ردی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے اب کچھ حاصل ہونے کی توقع نہ ہو یعنی لوگ بالکل ہی بے جان اور بے روح ہو کر رہ گئے ہوں۔ (باقی)

تزکیۂ نفس

کتمانِ علم کے اسباب اور اس کا علاج

(از مولانا امین احسن اصلاحی)

بسلسلۂ گذشتہ

علم، خواہ ہمارے اپنے تجربات کا حاصل کردہ ہو یا خدا کا نازل کردہ، بندوں کے پاس اللہ کی امانت ہے اور اس امانت کا پہلا حق تو یہ ہے کہ ہر نسل اس کی پوری پوری حفاظت کرے، اس سے کما حقہٗ فائدہ اٹھائے، اس کو اپنے امکان کے حد تک ترقی دے اور دوسرا حق یہ ہے کہ پوری احتیاط و دیانت کے ساتھ اس کو اپنے بعد آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کر دے۔ اسی دیانتدارانہ توریث و توارث پر اس دنیا کی تمام مادی و روحانی خوشحالیاں اور ترقیاں مبنی ہیں۔ اگر اس میں کوئی خلل اور فساد واقع ہو جائے تو دفعتہً سارے نظامِ زندگی میں خلل اور فساد برپا ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا مادی اعتبار سے جو باغ و بہار نظر آ رہی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ پچھلی نسلوں نے جو تجربات جمع کیے تھے وہ ہم تک منتقل ہوتے رہے اور ہم نے ان سے فائدہ بھی اٹھایا اور ان کو ترقی بھی دی۔ اگر یہ ہم تک منتقل نہ ہو پاتے یا ہم نے ان کو حاصل کرنے یا ان کو ترقی دینے کا اہتمام نہ کیا ہوتا تو یہ دنیا آج جہاں ہے اس سے بہت پیچھے ہوتی۔ اسی طرح ضروری ہے کہ جو روحانی اور اخلاقی علوم اللہ تعالیٰ نے اتارے ہیں وہ بھی صحیح طور پر ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوتے رہیں۔ اگر ان کے صحیح طور پر منتقل ہوتے رہنے کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ روشنی کی جگہ تاریکی نے اور اسلام کی جگہ جاہلیت نے اپنا تسلط جما لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس امت کو بھی اپنی شریعت کا علم دیا اس پر جہاں یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ اس پر اخلاص کے ساتھ عمل کرے وہیں یہ ذمہ داری بھی ڈالی کہ وہ اس کو پوری دیانت کے ساتھ بعد کی نسلوں کی طرف منتقل بھی کرے۔ چنانچہ اہل کتاب کو جب اللہ تعالیٰ نے اس علم کی امانت سونپی تو ان سے یہ عہد لیا کہ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آل عمران-۸۷

(تم اس کو لوگوں پر کھول کر واضح کروگے اور اس کو چھپاؤ گے نہیں) ۔ اور جب ان سے اس فرض کے ادا کرنے میں کوتاہیاں ہوئیں تو ان کو تنبیہ بھی فرمائی کہ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ (البقرہ۔ ۲۸۳)
(اور اس شہادت کو جو تمہارے پاس ہے چھپاؤ نہیں، جو اس کو چھپائے گا تو اس کا دل گنہگار ہے) ۔

یہود نے جب اس عہد اور اس تنبیہ کی کوئی پروا نہ کرتے ہوئے محض جمع دنیا میں خدا کے اس علم کو چھپایا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ بِمَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ... (البقرہ۔ ۱۵۹)

جو لوگ اُن واضح آیات اور اس ہدایت کو چھپاتے ہیں جو ہم نے اتاری ہیں، بعد اس کے کہ ہم نے ان کو کتاب میں کھول کر لوگوں کے لیے بیان کر دیا ہے، وہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ لعنت کرتا ہے ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ۔ (البقرہ۔ ۱۷۴)

جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں سے اتاری ہے اور اس کے عوض میں حقیر قیمت وصول کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا اور کچھ نہیں بھر رہے ہیں ۔

اور ان سے یہ امانت چھین کر امتِ مسلمہ کے سپرد کی اور اس پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ جس طرح اللہ کے آخری رسول نے ان کو خدا کا یہ دین پہنچایا ہے اسی طرح یہ اس کو دوسروں تک پہنچاتے رہیں۔ چنانچہ اس امت کو مخاطب کرکے فرمایا۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۔ (البقرہ۔ ۱۴۳)

چنانچہ ہم نے تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی ایک امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دو اور رسول تم پر اس دین کی گواہی دے ۔

اب یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس علم پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں پر بھی قیامت تک اس کی شہادت دیتی رہے اور اگر اس میں کوئی کوتاہی کرے تو خدا اللہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہے ۔

اس ذمہ داری سے فرار اختیار کرتے یا اس میں کوتاہی کرنے کے بھی کچھ خاص اسباب ہیں جو ہم یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کرینگے۔ یہ اسباب بجائے خود ایسے ہیں کہ ان کے نگاہوں کے سامنے آجانے کے بعد توقع ہے کہ ہر شخص جس کے اندر ایمان کی کوئی رمق ہے وہ ان سے بچنے کی کوشش کریگا۔ بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کے اسباب کا جان لینا ہی ان کے علاج کے لیے کافی ہوتا ہے بشرطیکہ کوئی شخص صحت کا سچا طالب ہو۔

معاشرہ کی ذمہ داری سے بے خبری | اس کتمانِ علم کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ بہت لوگ سرے سے معاشرہ کی اصلاح و درستگی سے متعلق اپنی کوئی ذمہ داری سمجھتے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک آدمی پر جو کچھ بھی ذمہ داری ہے وہ صرف اس کے اپنے نفس کی ہے، اگر اس کو اس نے ٹھیک رکھنے کی کوشش کی ہے تو اس نے دین اور علم دین کا حق ادا کردیا، اس بات سے اس کی دینداری میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ جس معاشرہ میں وہ رہا ہے اس کا کیا حال ہے اور اس کو دین سے باخبر رکھنے میں اس نے کوئی حصہ لیا ہے یا نہیں۔ وہ اس کو ایک پرایا جھگڑا سمجھتے ہیں جس میں اپنی ٹانگ نہ پھنسانا ہی ان کے نزدیک تقویٰ ہے۔ بعض لوگوں کے اندر تو یہ تصور اس طرح جم جاتا ہے کہ وہ زندگی کا ایک بالکل ہی راہبانہ نقطۂ نظر اختیار کر لیتے ہیں اور معاشرہ کے بُرے اور بھلے سے یک قلم کنارہ کش ہو جاتے ہیں بعض لوگ اس حد تک تو معاشرہ سے بے تعلقی نہیں اختیار کرتے لیکن وہ بھی اس ذمہ داری کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو فی الواقع دین میں اس کی ہے۔ ان کے نزدیک اگر یہ نیکی بھی ہے تو ایک نفلی نیکی ہے جس کے کرنے سے آدمی کے اجر و ثواب میں کچھ اضافہ تو ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ نہ کرے تو اس سے کوئی گناہ لازم نہیں آتا۔ اس طرح کے کسی کام کو اگر وہ کرتے بھی ہیں تو اس کو وہ خود اپنے فرائض کا کوئی جزو نہیں سمجھتے بلکہ دوسروں کے فرائض کا ایک حصہ سمجھتے ہیں جس کو تبرعاً یہ انجام دے رہے ہیں۔ یہ رائے رکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ نہ تو کوئی شخص معاشرہ کی جہالت اور اس کے بگاڑ کا حقیقی دکھ محسوس کرسکتا اور نہ وہ لوگوں کے ذہن و فکر اور ان کے اعمال و اخلاق کے بدلنے کے لیے کوئی مؤثر اور نتیجہ خیز جد و جہد ہی کرسکتا ہے۔ اول تو وہ کچھ کریگا ہی نہیں اور اگر کریگا بھی تو اسکی نوعیت محض چھدا اتارنے کی ہوگی۔ وہ لوگوں کو ان کی حقیقی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے اور ان کے بگاڑ کے اصلی اسباب سے پردہ اٹھانے کے بجائے ہمیشہ کچھ اوپری قسم کی لیپ پوت کر کے اپنی مصلحت کی دھونس جمانا چاہیگا۔ ایسے شخص کے لیے یہ نہایت مشکل ہے کہ وہ لوگوں کی کسی ایسی برائی کو برائی کہنے کی جرأت کرسکے جس کو

لوگ بھلائی بنائے ہوئے بیٹھے ہوں اور جس کو برائی کہنے سے وہ غضبناک ہوتے ہوں، بالخصوص ان برائیوں کو برائی کہنا تو ایسے شخص کے لیے بالکل ہی محال ہے جن کے جواز کا فتویٰ وقت کے ارباب اقتدار نے دے رکھا ہو یا جن کو وہ عملاً اپنائے ہوئے ہوں۔ ایسے لوگ قرآن بھی پڑھاتے ہیں، حدیث بھی سکھاتے ہیں اور فقہ و تصوف کے رموز بھی بتاتے ہیں اور یہ سب کچھ بظاہر وہ علم دین کی اشاعت ہی کے لیے کرتے ہیں، لیکن یہ ساری چیزیں وہ اس طرح سکھاتے اور پڑھاتے ہیں کہ گویا یہ ماضی بعید کی حکایتیں ہیں جن کا کوئی حرف بھی حال پر منطبق نہیں ہوتا۔

بہت سے لوگ جان بوجھکر یہ روش اپنے آپ کو ذمہ داریوں سے بچانے کے لیے اختیار کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ عام طور پر لوگ معاشرہ سے متعلق اپنی ذمہ داری کی حقیقی نوعیت سے آگاہ ہی نہیں ہیں وہ یہ جانتے ہی نہیں کہ اسلام نے ہر شخص پر اصلاح کی دہری ذمہ داری ڈالی ہے، ایک خود اس کی اپنی ذات سے متعلق ہے اور دوسری، اپنے علم و استعداد کی حد تک اپنے کنبہ، اپنے قبیلہ اور اپنے معاشرہ کی اصلاح سے متعلق ہے اور اس ذمہ داری کی اہمیت اس قدر ہے کہ ایک شخص خود اپنی تعلیم و تربیت سے بے پروائی کی سزا جس طرح دنیا میں بھگتتا ہے اور آخرت میں بھگتیگا اسی طرح، اگر وہ معاشرہ کی اصلاح اور اس کی تعلیم و تربیت سے بے پروائی اختیار کرے تو اس کی سزا دنیا میں بھی بھگتے گا اور آخرت میں بھی۔ ہم یہاں چند حدیثیں پیش کرتے ہیں جن سے اس فرض کی حقیقی اہمیت واضح ہوگی۔

"ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جو شخص بھی تم میں سے کوئی بگاڑ دیکھے تو اپنے ہاتھ سے اسکی اصلاح کرے، اگر اسکی طاقت رکھتا ہو۔ اگر ہاتھ سے اس کی اصلاح کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اسکی اصلاح کی کوشش کرے۔ اگر زبان سے بھی اس کی اصلاح کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل سے اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے" (مسلم)

"ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جتنے پیغمبر بھی مجھ سے پہلے گذرے ہیں ان کی امتوں میں اُن کے جان نثار اور ان کے صحابی ہوتے رہے ہیں جو ان کی سنت کی پیروی اور ان کے احکام کی اقتدا کرتے رہے ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین پیدا ہوئے جو کہتے تھے وہ کچھ جو کرتے نہیں تھے اور کرتے تھے وہ کام جن کا ان کو حکم نہیں ملا ہوا ہوتا تھا۔ تو ایسوں سے جن نے

ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن، جس نے ان سے دل سے جہاد کیا وہ مومن، اور جس نے ان سے زبان سے جہاد کیا وہ مومن۔ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔" (مسلم)

"نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حدود الٰہی کے معاملہ میں سستی کرنے والے اور ان کے اندر جا پڑنے والے کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کچھ لوگ ایک کشتی کے اوپر اور نیچے کے حصوں پر قرعہ ڈالیں، کچھ کے حق میں نیچے کا قرعہ نکلے اور وہ نچلے حصہ میں بیٹھیں اور کچھ اس کے اوپر والے حصہ میں بیٹھیں نیچے والوں میں سے کسی کو پانی کی ضرورت پیش آئے تو اس کو اوپر والوں کے پاس سے گذرنا پڑے جس سے اوپر والے تکلیف محسوس کریں۔ یہ دیکھ کر کوئی نیچے والا کلہاڑا اٹھا کر کشتی کے پیندے ہی میں سوراخ کرنا شروع کر دے۔ جب اوپر والے آکر پوچھیں کہ یہ کیا تو وہ جواب دے کہ ہمارے اوپر جانے سے آپ لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اور ہمارے لیے پانی لینا ناگزیر ہے تو اس کے سوا کیا چارۂ کار ہے؟ اب اگر اوپر والے اس کا ہاتھ پکڑیں تو اس کو بھی بچائینگے اور اپنے آپ کو بھی بچائیں گے۔ اور اگر اس کو آزاد چھوڑ دیں گے تو اس کو بھی ہلاک کریں گے اور اپنے آپ کو بھی ہلاک کریں گے۔" (بخاری)

"ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم پر ایسے لوگ حاکم بنائے جائیں گے جن سے معروف اور منکر دونوں طرح کی باتیں صادر ہونگی تو جس نے ان کی بری باتوں کو برا سمجھا تو وہ تو بری ہوا اور جس نے ان کی برائیوں کے خلاف آواز اٹھائی وہ سلامت رہا۔ البتہ اس کی خیر نہیں ہے جو راضی رہا اور جس نے ان کی پیروی کی۔" (مسلم)

"حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم نیکی کی طرف دعوت دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا ورنہ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے اور پھر تم اس کو پکارتے رہو لیکن تمہاری کوئی شنوائی نہ ہو" (ترمذی)

"ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے اعلیٰ جہاد کسی حق سے ہٹے ہوئے بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہہ گزرنا ہے" (ابو داؤد۔ ترمذی)

"حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے لوگو! تم اس آیت کا حوالہ دیتے ہو یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ[1] (یعنی اس آیت سے تم یہ غلط استدلال کرتے ہو کہ آدمی پر بس اپنے ہی نفس کی اصلاح کی ذمہ داری ہے، دوسروں کی کوئی ذمہ داری اس کے سر نہیں ہے) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب لوگ کسی ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں لیکن اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ ان پر کوئی ایسا عذاب بھیج دے جس کی لپیٹ میں سب ہی آ جائیں۔" (ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جس کو وہ جانتا ہے لیکن اس نے چھپائی تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام لگائی جائے گی۔" (احمد، ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

ان حدیثوں پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ دین کی باتوں کو آشکارا کرنا، لوگوں کی جہالت کو دور کرنا، مخالف اسلام حرکتوں کے خلاف خطرات سے بے پروا ہو کر آواز اٹھاتے رہنا اور جو کچھ حق ہے بے خوف لومۃ لائم لوگوں کو بتلاتے رہنا صرف ایک نفلی نیکی ہی نہیں ہے بلکہ ہر شخص پر اس کی استعداد اور صلاحیت کے لحاظ سے یہ واجب ہے اگر کوئی شخص علم اور صلاحیت رکھتے ہوئے برائیوں کی اصلاح کی کوشش نہیں کرے گا تو وہ جرم اور اس کی سزا دونوں میں اصل مجرمین کا شریک ٹھیرے گا۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ شخص ہو گا جو ہاتھ اور زبان سے اصلاح کی سرے سے طاقت ہی نہ رکھتا ہو۔ ایسے اشخاص سے اسلام کا کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ وہ برائی کو برائی سمجھتے رہیں اور اپنے آپ کو اس سے دور رکھیں۔

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کوئی شخص محض خیالی اندیشوں یا محض معمولی مشکلات و خطرات کو بہانہ بنا کر اپنے آپ کو اصلاح معاشرہ کی ذمہ داریوں سے بری نہیں ٹھیرا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ بعض اوقات معاشرہ اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ اس کی اصلاح ناممکن ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر ایک شخص اصلاح کی کوشش نہ کرے تو اس کو معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن معاشرہ کا ہر درجہ کا بگاڑ وہ بگاڑ نہیں ہے جس کی آڑ لیکر ایک شخص گھر میں بیٹھ رہے اور یہ اعلان کر دے کہ لوگوں کے حالات اس درجہ خراب ہو چکے ہیں کہ ان کی اصلاح و تعلیم میں وقت

[1] اے ایمان والو، تم اپنے آپ کو سنبھالو، اگر تم راہ یاب ہو تو وہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے جو گمراہ ہوئے۔

ضائع کرنے کے بجائے اب خانہ نشین ہو جانے اور صرف اپنے ایمان و اسلام کے سنبھالنے کا وقت آ گیا ہے۔
اسلام نے معاشرے کی بگاڑ کی وہ حد خود بتادی ہے جس کے بعد ایک شخص کے لیے یہ بات جائز ہوتی ہے کہ وہ عوام کی اصلاح کی ذمہ داری سے کنارہ کش ہو کر صرف اپنے ہی دین و ایمان کو بچانے کی فکر کرے۔ وہ حد یہ ہے کہ معاشرے میں سرے سے دین کی کوئی رمق باقی ہی نہ رہ گئی ہو، ہر شخص حقوق ادا کرنے کے بجائے حرص و طمع کو معبود بنائے بیٹھا ہو، شریعت کے بجائے ہر جگہ خواہشات کی پیروی ہو رہی ہو، ہر جگہ دین پر دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہو، ہر شخص اپنی ہی رائے اور اپنے اپنے خیال میں مگن ہو اور کسی کی بہتر سے بہتر بات بھی سننے کے لیے تیار نہ ہو۔ یہاں تک کہ یہ بات نہایت واضح طور پر نظر آنے لگے کہ اب اس معاشرہ کو بدلنا تو ممکن نہیں ہے البتہ یہ خطرہ نہایت قوی ہے کہ آدمی اگر اس کے اندر پڑا رہا تو خود تبدیل ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں ایک شخص کے لیے بے شک یہ بات جائز ہے کہ وہ لوگوں کو چھوڑ کر صرف اپنا ایمان بچانے کی کوشش کرے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔

"ابو ثعلبہؓ سے علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم والی آیت کے بارے میں روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم میں نے اس آیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا (سوال غالباً یہی ہو گا کہ لوگ عام طور پر اس آیت سے یہ دلیل لاتے ہیں کہ ہر آدمی پر صرف اس کے اپنے ہی نفس کی ذمہ داری ہے) تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ صحیح رویہ یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کو معروف کی تعلیم دو اور منکر سے روکو، ہاں جب دیکھو کہ بخل مسلط ہو چکا ہے، خواہشات کی پیروی ہو رہی ہے، دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہے، ہر صاحب رائے اپنی رائے پر فریفتہ ہے اور تمہیں یہ بھی صاف نظر آنے لگے کہ اب تمہیں خود اپنے ایمان کے بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ناگزیر ہو گیا ہے تو بس اپنے کو بچاؤ اور عوام کو ان کے حال پر چھوڑ دو" (ترمذی۔ ابن ماجہ)۔

ایک اور حدیث میں یہی حقیقت ان الفاظ میں واضح کی گئی ہے۔

"عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (باقی ۴۱۶ پر دیکھیں)

رسائل و مسائل

حضرت لُوط علیہ السلام کے واقعہ کی توجیہ

قرآن مجید میں حضرت لوط علیہ السلام کی جو سرگذشت سورۂ حجر، سورۂ ہودؑ اور بعض دوسری سورتوں میں بیان ہوئی ہے اس کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے کہ جب ان کے گھر وارد ہونے والے خوبصورت مہمانوں کو ان کی قوم کے بدکار اور نابکار لوگوں نے دیکھا تو وہ نہایت ناپاک ارادے سے ان کے گھر پر ٹوٹ پڑے اور ان کی رسوائی کے درپے ہوئے۔ اس وقت حضرت لوط علیہ السلام نے نہایت پریشانی کے عالم میں ان بدکار لوگوں کو مخاطب کر کے جو الفاظ فرمائے وہ سورہ حجر میں یوں نقل ہوئے ہیں۔ قَالَ اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ ضَیْفِیْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۝ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْھَکَ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ قَالَ ھٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِیْٓ اِنْ کُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝ (اس نے کہا یہ میرے مہمان ہیں تو تم مجھے رسوا نہ کرو اللہ سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو، وہ بولے کہ کیا ہم نے تمہیں دوسروں کو اپنے ہاں بلانے سے روکا نہ تھا؟ اس نے کہا یہ میری لڑکیاں ہیں، اگر تم کچھ کرنے والے ہو)۔

ایک رفیق نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ قرآن میں یہ بات نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور تم نے بھی اپنے ایک مضمون مندرجہ ترجمان القرآن جلد ۶۴ عدد ۴ میں اس کی طرف ایک سرسری اشارہ ہی کر کے چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ تمہارا اجمال قرآن کے اجمال سے بھی زیادہ ہے جس سے ذہن میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ اس کی پوری وضاحت ہونی چاہیے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ یہ میری لڑکیاں ہیں، اگر تم کچھ کرنے ہی والے ہو"

جواب

حضرت لوط علیہ السلام کے اس قول کی چند توجیہیں سامنے آتی ہیں:

ایک تو یہ کہ یہ بات انہوں نے انتہائی اضطرار اور مجبوری کے عالم میں فرمائی ہو جب انہوں نے دیکھا ہو کہ اب اپنے مہمانوں کو ان کمینہ لوگوں سے بچانے کی کوئی تدبیر بھی باقی نہیں رہ گئی ہے تو خدا کے بھروسہ پر اپنا سب کچھ بازی پر لگا دینے کے لیے تیار ہو گئے ہوں کہ شاید ادھر سے ان سے نجات پانے کی کوئی راہ نکلے۔

دوسری یہ کہ انہوں نے بحیثیت ایک بزرگِ قوم کے ان غنڈوں کو یہ نصیحت فرمائی ہو کہ بجائے یہ ذلیل اور رسواکن حرکت کرنے کے وہ اپنے شہوانی جذبات کی تسکین کے لیے عورتوں کی طرف توجہ کریں۔ اور "بناتی" سے ان کی مراد اپنی صاحبزادیاں نہ ہوں بلکہ قوم کی بیٹیاں ہوں۔

تیسری یہ کہ انہوں نے اپنی ہی صاحبزادیوں کو پیش تو کیا ہو لیکن نکاح کے لیے نہ کہ سفاح کے لیے۔

ان میں سے آخری دو توجیہیں عام طور پر تفسیر کی کتابوں میں ملتی ہیں لیکن میرا دل ان پر نہیں جمتا۔ جہاں تک آپ کی صاحبزادیوں کا تعلق ہے جس طرح ان کے سفاح کے لیے پیش کیے جانے کا تصور نہیں کیا جاسکتا اسی طرح ایسے غنڈوں کے آگے، جب کہ وہ کافر بھی ہوں، ایک پیغمبر باپ کی طرف سے ان کا نکاح کے لیے بھی پیش کیا جانا کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ رہی یہ بات کہ انہوں نے قوم کے بزرگ کی حیثیت سے ان اشرار کو قضائے شہوت کے لیے طبقۂ نسواں کی طرف توجہ دلائی ہو اور ھٰؤلاء بناتی سے انہوں نے اپنی لڑکیوں کے بجائے قوم کی لڑکیوں کو مراد لیا ہو تو مجھے یہ توجیہ بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ اولاً تو ھٰؤلاء بناتی کا یہ مفہوم لینا صریح تکلف ہے، ثانیاً اس کے جواب میں پھر اشرار کے اس قول کا کیا مطلب ہوگا کہ قالوا لقد علمت ما لنا فی بناتك من حق (وہ بولے کہ تم تو جانتے ہی ہو کہ تمہاری لڑکیوں میں ہمارا کوئی حق نہیں ہے) اگر مراد قوم کی لڑکیاں ہوتیں تو ان کے اندر تو شادی بیاہ کرنے کا ان کو حق حاصل تھا اور وہ اس حق کو استعمال بھی کرتے تھے، غیر فطری رجحان کے غلبہ کے باوجود وہ شادی بیاہ سے تو یک قلم دستبردار نہیں ہو گئے تھے؛ نیز حضرت لوط علیہ السلام کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا کہ ان کنتم فاعلین (اگر تم کچھ کرنے ہی پر تل گئے ہو) اس سیاق و سباق میں تو اس فقرہ کا کوئی مطلب باقی نہیں رہتا۔

اب رہی پہلی توجیہ تو اس کا ایک محمل ضرور سمجھ میں آتا ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے یہ بات انتہائی مجبوری اور اضطرار کے عالم میں جیسا کہ حضرت کے ارشاد سے خود واضح ہے، محض قوم کی اخلاقی حس بیدار کرنے اور ان کو ہوش میں لانے کے لیے فرمائی ہو۔ مقصود ان کا صاحبزادیوں کو پیش کرنا نہیں بلکہ یہ تھا، کہ بدکاری کے نشہ میں سرشار لوگ سوچنے پر مجبور ہوں کہ ہمارے اندر ایک تو یہ غیرت مند اور شریف انسان ہے جو اپنے مہمانوں کے ناموس کے لیے خود اپنا ناموس بھی خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہو گیا ہے اور اسی بستی میں ہم ایسے نابکار بھی ہیں کہ اس کے مہمانوں کے ناموس کے درپے ہیں۔ اس طرح کی قربانی اور جانبازی بسا اوقات بڑے بڑے بدمستوں کی آنکھیں بھی کھول دیتی ہے۔ فرض کیجیے کچھ پاجی لوگ کسی شریف اور وفادار آدمی کے پڑوسی پر اس کو قتل کر دینے کے ارادہ سے پل پڑیں یا اس کے بیوی بچوں کے ناموس کے درپے ہو جائیں اور وہ شریف ان سے یہ التجا کرے کہ بھائیو! اگر تم اس کو قتل کرتے یا اس کا ناموس لوٹنے ہی کے درپے ہو گئے ہو تو اس سے پہلے میرا گھر جلا دو اور میرے عزت و ناموس کو برباد کر لو تو اس سے اس کا مقصود فی الواقع یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنا ناموس ان کی نذر کر رہا ہے بلکہ اس طرح وہ مخاطب کی اخلاقی حس کو بیدار کرنا چاہتا ہے اور اگر مخاطب کے اندر نیکی اور خدا ترسی کی ادنیٰ رمق بھی باقی ہوتی ہے تو وہ کم از کم ایک مرتبہ سوچنے پر تو مجبور ہو ہی جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی طرح کے حالات اور اسی قسم کے مقصد کے تحت حضرت لوط علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا اور اس امید کے ساتھ فرمایا ہو گا کہ جب میں اپنے مہمانوں کے ناموس کی حفاظت کے لیے یہ آخری بازی بھی کھیل جاؤں گا تو کیا عجب ان لوگوں کے اندر کچھ شرم و غیرت پیدا ہو جائے اور اگر ان لوگوں کے اندر شرم و غیرت نہ پیدا ہوئی تو امید ہے کہ میرا رب میری مدد فرمائے گا اور میرے مہمان اور میرے اہل و عیال ان شریروں کے شر سے محفوظ ہو جائیں گے۔ ان کی قوم کے اشرار کے دل تو ان کے دلدوز فقروں سے نرم نہیں ہوئے لیکن اپنے رب سے جو امید انہوں نے باندھی تھی وہ پوری ہوئی یعنی قوم پر خدا کا عذاب نازل ہو گیا اور حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے صاحب ایمان اہل بیت کو خدا نے اپنے فرشتوں کی حفاظت میں ان کے

دار الہجرت میں پہنچا دیا۔

قرآن میں اس واقعہ کے بیان میں جو اجمال ہے وہ ایک حکیم کے کلام کے شایانِ شان ہے۔ اس کے ہر اجمال کے اندر معارف کے خزانے ہیں۔ لیکن اگر میرے کلام میں کہیں اغلاق و ابہام یا کسی قسم کا سوءِ تعبیر ہے تو وہ محض میری قلتِ علم کا نتیجہ ہے۔ اگر کسی رفیق کو میری عبارت سے کوئی الجھن ہوئی ہے تو اس کی ذمہ داری قرآن حکیم پر نہیں بلکہ تنہا مجھ پر ہے۔ رب کریم و رحیم میری ہر لغزش کو معاف فرمائے۔ (ا۔ ا۔ ا)

ائمۂ اربعہ و اہلِ بیت

سوال۔ جناب کیا فرماتے ہیں اس مسئلے میں کہ ائمۂ اربعہ کے علوم کی انتہا ائمۂ اہلِ بیت تک ہوتی ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ یہ سب ان ہی حضرات کے شاگرد تھے، خاصکر حضرت امام اعظمؒ کو حضرت جعفر صادق سے شرفِ تلمذ و شاگردی حاصل تھا جو علی العموم صاحبانِ علم بیان کرتے ہیں۔ اگر ہم بجائے دیگر ائمہ کے ائمۂ اہلِ بیت کی براہ راست پیروی کریں اور بجائے شاگرد کے استاذ کی اقتداء و تقلید کریں تو ہم میں شائبۂ تشیع تو پیدا نہ ہو گا۔ بینوا توجروا

جواب۔ ائمۂ اربعہ نے ان تمام اہلِ علم سے استفادہ کیا ہے جو ان کے عہد میں موجود تھے اور جن سے استفادہ کرنا ممکن تھا۔ ان میں اہلِ بیت بھی تھے اور غیر اہلِ بیت بھی۔ صرف اہلِ بیت سے علمی استفادہ کرنے کا طریقہ تو خود اہلِ بیت نے بھی اختیار نہ کیا تھا۔ وہ بھی جس جس کے پاس علم پاتے تھے اس سے استفادہ کرتے تھے۔ یہی ہر اس شخص کا طریقہ ہونا چاہیے جو کسی طرح کے تعصب میں مبتلا نہ ہو۔ (ا۔م)

مباہلہ و مناظرہ

سوال - میرے ایک عزیز نے جو ایک دینی مدرسے کے فارغ ہیں، مجھ سے یہ دریافت کیا ہے کہ مولانا مودودی دعوتِ مباہلہ و مناظرہ کو کیوں قبول نہیں کرتے حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہود سے مباہلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اور انبیاء و سلف صالحین بھی مناظروں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ مخالفین بار بار آپ کو چیلنج کرتے ہیں لیکن آپ اُن سے نہ مباہلہ کرتے ہیں اور نہ ہی مناظرہ کے لیے تیار ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی حد تک اپنے عزیز کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن سے کہا ہے کہ ہر مباہلے یا مناظرے کی دعوت قبول کرنا فرض یا سنت نہیں ہے۔ تاہم اگر آپ بھی اس بارے میں اپنا عندیہ بیان کر دیں تو وہ مزید موجب اطمینان ہوگا۔

جواب - آپ کے جن عزیز نے فرمایا ہے کہ آنحضورؐ نے یہود سے مباہلہ کا فیصلہ فرمایا تھا ان کی معلومات ناقص ہیں۔ مباہلہ کا فیصلہ حضورؐ نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اور یہ مباہلہ یہود سے نہیں بلکہ عیسائیوں سے کیا گیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں مباہلہ کا صرف یہی ایک واقعہ ملتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے مباہلے کو نزاعی امور کے فیصلے کا مستقل حل قرار نہیں دیا ہے کہ جب کبھی کسی کافر یا مسلمان سے کسی قسم کا اختلاف ہو تو فوراً مباہلے کی دعوت دے ڈالی جائے۔ پیشہ ور مناظرین نے آجکل مباہلے کو کشتی کے داؤں میں باضابطہ طور پر شامل کر لیا ہے لیکن پوری تاریخ اسلام میں مباہلہ کی دعوت دینے اور اُسے قبول کرنے کی مثالیں مشکل ہی سے مل سکیں گی۔ صحابۂ کرام میں بڑے بڑے اختلافات ہوئے، حتیٰ کہ بعض اوقات لڑائیوں تک کی نوبت آئی لیکن مباہلہ کرنے کی نوبت شاذ و نادر ہی آئی ہے۔ تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوئے، بڑے بڑے مسائل پر بحثیں بھی ہوئیں لیکن مباحثہ کے بجائے مباہلہ کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ بعد کے زمانوں میں بھی علماء کے مابین اختلاف رائے کا ظہور ہوا، تکفیر و تفسیق کا بازار بھی گرم ہوا لیکن مباہلے کو کبھی کسی نے اپنا معمول نہیں بنایا۔

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ کے مخالفین کثیر تعداد میں موجود تھے، یہود، نصاریٰ، منافقین ہر ایک نے قدم قدم پر آپ کی مخالفت کی مگر ایک نجران کے نصاریٰ کے سوا اور کسی سے مباہلہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ مباہلہ ایک استثنائی طریق کار تھا جسے بعض خاص وجوہ و حالات کی بنا پر صرف نجران کے عیسائیوں کے معاملے میں خود اللہ تعالیٰ نے متعین فرمایا تھا[1] اور یہ مسائل کے تصفیے کا کوئی مقرر قاعدہ و ضابطہ نہیں ہے جسے ہمیشہ ہر متنازع فیہ معاملے میں اختیار کیا جا سکے۔ نجران کے معاملے میں جو خاص طور پر یہ شکل اختیار کی گئی اس کی ایک وجہ جو احادیث سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نجران کے تین دینی پیشوا جو وفد کی شکل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے وہ اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے قائل اور معترف ہو چکے تھے، لیکن صرف اپنی قوم میں اپنا وقار برقرار رکھنے کے لیے ایمان لانے سے پرہیز کر رہے تھے۔ سفر کے دوران میں ان میں سے جب ایک نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ناشائستہ الفاظ اپنی زبان سے نکالے تو دوسرے نے فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ اس شخص (رسول اللہ صلعم) سے متعلق نازیبا کلمات استعمال نہ کرو کیونکہ یہ وہی نبی ہے جس کے بارے میں پیشنگوئیاں ہماری کتابوں میں مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو چونکہ علم غیب کی بنا پر ان کے دلوں کا چور معلوم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ یہ لوگ اس دلی اعتراف کے بعد مباہلے کی دعوت قبول کرنے اور لعنۃ اللہ علی الکاذبین کہہ کر اپنے اوپر لعنت مسلط کرنے کی جرأت کبھی نہیں کریں گے، اس لیے ان کی باطنی کیفیت کو بے نقاب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ شکل تجویز فرمائی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ وہی نکلا۔ وفد نجران نے مباہلہ کرنے سے گریز کیا اور ان کا کذب و نفاق بالکل عیاں ہو گیا۔

آپ کے عزیز نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ میں مناظرہ کیوں نہیں کرتا حالانکہ انبیاء و صلحاء اپنے مخالفین سے مناظرے کرتے رہے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مناظرہ یا مجادلہ صرف بحث و استدلال کی حد تک محدود تھا اور آج کل عرف عام میں جس چیز کو مناظرہ کہا جاتا ہے اس کی نوعیت مرغ بازی کی سی ہے۔ معقول طریق پر اگر کوئی آدمی کسی مسئلے پر زبانی یا تحریری بحث کرے تو مجھے اس پر اعتراض نہیں ہوتا اور اگر ممکن اور ضروری سمجھوں تو ایسی بحث میں حصہ بھی لے لیتا ہوں لیکن پیشہ ور اور جھگڑالو مناظر بازوں سے بحثیں لڑانا میرا کام نہیں ہے۔ یہ شغل جن لوگوں کو زیب دیتا ہے وہ بخوشی اسے اختیار کیے رکھیں۔ (ا۔م)

[1] اس سلسلے میں یہ امر بھی زیر نظر رہنا چاہیے کہ مباہلہ کا یہ واقعہ انتہائی سنجیدگی کی فضا میں ہوا تھا۔ اس میں وہ عامیانہ مباہلوں و مناظروں کی سی غوغا آرائی اور دھینگا مشتی ہرگز نہ تھی۔ حضور کی دعوت مباہلہ بڑے ہی خیر خواہانہ اور دردمندانہ جذبات کی فضا اپنے اندر لیے ہوئے تھی۔ آج جو دنگل رچانے کا طریقہ چل پڑا ہے اس کو پیغمبر کی سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (ا۔ ص)

مطبوعات

حقوق انسانی | مؤلفہ: محترمہ رقیہ علامہ خلیل عرب۔ شائع کردہ میمن خواتین ایجوکیشنل سوسائٹی۔ قیمت للعہ۔

مؤلفہ دینی رجحانات رکھنے والے علمی حلقہ میں متعارف ہیں۔ آپ نے دین و ملت کی خدمت کے جذبے سے متعدد تالیفی کام کیے ہیں جن میں سے ایک یہ کتاب ہے۔ اس کتاب کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ دین اسلام سرتاپا نام ہی خدا اور خلق کے مختلف حقوق کی متوازن ترتیب کا ہے۔ چنانچہ خدا اور رسول کے حقوق سے آغاز کرتے ہوئے انسانیت کے حقوق مختلف مناصب و مراتب کے لحاظ سے پیش کیے گئے ہیں۔ والدین اور اولاد، علماء و اساتذہ اور متعلمین، حکمراں اور رعایا، شوہر اور بیوی، مہمان اور میزبان، بلکہ مزدوروں اور سائلوں تک کے بارے میں فاضل مؤلفہ نے بتایا ہے کہ بروئے کتاب و سنت ان کے کیا حقوق ہیں۔ سنت چونکہ مؤلفہ کا ایک دلپسند موضوع ہے اس لیے اس پر چھپنیں صفحات میں بہت اچھا موادِ مطالعہ جمع کر دیا ہے۔ معیارِ طباعت بہت اچھا، سائز بڑا۔ یہ کتاب، رونقِ اسلام گرلز اسکول ۱۲ پرنس اسٹریٹ نانک واڑہ کراچی، رونقِ اسلام ہائی اسکول کھلادر نزد پنجابی کلب، کراچی، اور ریاض سنز ناشران و تاجران کتب بکل روڈ کراچی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

ہمارا پاکستان | از جناب الطاف شوکت۔ ناشر: قومی کتب خانہ لاہور۔ قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے۔

الطاف شوکت دینی و ملی درد رکھنے والے ایک جواں ہمت سپاہی ہیں۔ موصوف اسلام کی خاطر پاکستان سے محبت رکھتے ہیں اور آرزو مند ہیں کہ یہ نوخیز سلطنت اسلامی اصولوں کو اختیار کر کے اخلاقی و مادی ہر دو لحاظ سے ترقی کرے۔ انہی جذبات کے ساتھ آپ نے پاکستان کی زرعی و معدنی دولت اور صنعتی و تجارتی حیثیت کا جائزہ لیا ہے۔ ساتھ کے ساتھ اسلام کے سیاسی و معاشی نظام پر بھی مختصر طور پر اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ آخری حصے میں مسلمانوں کو بیداری و حرکت اور جہاد و اجتہاد کا درس دیا ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ یہ کتاب عام مطالعہ کی چیز بھی ہے اور درسی مقاصد کے لیے بھی مفید ہے۔

خالی صفحه